ARE ALL RELIGIONS EQUAL?

(BY REV. BARAKAT ULLAH, M.A.)

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

مصنّفہ

پادری برکت اللہ ایم۔اے۔ایم۔آر۔اے۔ایس

کرسچن نالج سوسائٹی

S. P. C. K., LAHORE.

بار اوّل 1941. تعداد ۵۰۰

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

مُصنّفہ

پادری برکت اللہ صاحب ایم۔اے، ایم۔آر۔اے۔ایس

مُصنّف

محمد عربی۔ کلمتہ اللہ کی تعلیم۔ نور الہدیٰ۔ توضیح البیان فی اصول القرآن
دین فطرت۔ اسلام یا مسیحیت؟ اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی؟
صحت کتب مقدسہ۔ مسیحیت کی عالمگیری۔ دشت کربلا یا کوہ کلوری؟
مسیحیت اور سائنس۔ صلیب کے علمبردار وغیرہ وغیرہ

کرسچن نالج سوسائٹی۔ لاہور

۱۹۴۸ء

بار اوّل قیمت ۸/

ہندوستان کی کلیسیا کے لاکھوں مقدسوں

کی

یادگار

میں یہ کتاب لکھی گئی ہے

انہوں نے انجیل جلیل کی جانفزا البشارت پاکر اپنے گھروں بھائیوں بہنوں
ماں باپ عزیز و اقارب، جائداد وغیرہ کو خداوند کی خاطر چھوڑا۔ ان کے اپنے گھرانے
کے لوگ ان کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اس دنیا میں انہوں نے مسافرانہ بود و باش
کی۔ ہر قسم کے ظلم و ستم جور و جفا لعن طعن عقوبت اور اذیت سہی۔ وہ بھوکے ننگے بے
یار و مددگار بدسلوکی کی حالت میں مارے مارے پھرے۔ بعض مار کھاتے کھاتے مر گئے
بعض تلوار سے قتل کئے گئے۔ لیکن ان کی نظر ان کے ایمان کے بانی اور کامل کرنے
والے پر ٹکی رہی۔ جس نے اس خوشی کی خاطر جو اس کی نظروں کے سامنے تھی ذلت
کی پروا نہ کر کے صلیب کا دکھ سہا۔ دنیا ان کے لائق نہ تھی لیکن وہ کمزوری میں زورآور
ہوئے۔ وہ ایمان میں ثابت قدم رہ کر دلیرانہ صلیب کا پرچم لہراتے رہے۔ انہوں نے
مرتے دم تک ایماندار رہ کر زندگی کا تاج پایا۔ اور ایمان کے سبب انہوں نے سلطنتوں
کو مغلوب کر لیا۔ کیونکہ ان کو یہ اطمینان تھا کہ ان کا منجی دنیا پر غالب ہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

برکت اللہ

فہرست مضامین

دیباچہ

جب خُداوند مسیح اپنی زندگی کے آخری ہفتہ میں یروشلم گئے تو آپ نے خُدا کی ہیکل میں داخل ہو کر اُن سب کو نکال دیا جنہوں نے اُس عبادت گاہ کو ڈاکوؤں کی کھوہ بنا رکھا تھا۔ اِس پر اہل یہود کے سردار کاہن اور یہودی قوم کے بزرگ غضبناک ہو کر خُداوند مسیح کے پاس آئے اور اُنہوں نے آپ سے پُوچھا:۔

"تُو ان کاموں کو کس اختیار سے کرتا ہے؟ اور کس نے تجھے یہ اختیار دیا ہے" (متی ۲۱/۲۳)

دَورِ حاضرہ میں مسیحیت کی طفیل ہندوستان میں سے ہر قسم کی بدروحیں نکل رہی ہیں۔ جہالت کی ناپاک رُوح نے دم توڑ دیا ہے۔ وہ لوگ جو اروحِ بد کی خوف و دہشت کی زنجیروں میں مقید ہو کر ہر وقت ترساں اور لرزاں رہتے تھے اور تعویذ اور گنڈے سے تلاش کرتے پھرتے تھے مسیحیت کی بدولت بے باک ہو کر آزاد پھر رہے ہیں۔ اچھوت کی بدرُوح چیخ چیخ کر پکارتی اور کہتی ہے:۔

"اے خُدا کے بیٹے ہمیں تجھ سے کیا کام؟ مَیں تیری منّت کرتی ہُوں۔ مجھے عذاب میں نہ ڈال" (لوقا ۸/۲۸)

کلمتہ اللہ کی زبانِ معجز بیان نے دیوداسی۔ حرامکاری اور شہوت۔ باہمی پرخاش اور عداوت جبر تحکم اور دحشت وغیرہ بیماریوں کو ایک کلمہ سے دور کر دیا اور ہندوستان کو جنت نشان بنا دیا ✣

لیکن ہندوستان کے غیر مسیحی مذہبی پیشوا اور قوم ہند کے لیڈروں کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ مسیحیت کی اشاعت سے ان کی تعداد رسوخ اقتدار اور وقار میں فرق آ جائیگا اور اُن کی اقتصادی اور سیاسی طاقت کو ضعف پہنچیگا پس وہ خداوند مسیح کے نام لیواؤں کو ڈانٹ کر پوچھتے ہیں "تم ان کاموں کو کس اختیار سے کرتے ہو" کس نے تم کو یہ اختیار دیا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو مسیحیت کا حلقہ بگوش کرو؟ ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ تم ہمارے لوگوں کو اُن کے مذہب اور ملت سے نکال کر مسیحی کلیسیا میں داخل کرو۔ اگر تم اپنی عمر اور مال و زر اُن کو دُنیادی تعلیم دینے اور راہ نیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرنے میں صرف کرنا چاہتے ہو تو ہم کو اعتراض نہیں لیکن ہم اس بات کی ہرگز اجازت نہ دینگے کہ وہ اپنے مذہب کو تبدیل کر کے مسیحی ہو جائیں اور صرف مسیح کو واحد منجی مانیں۔ ان کا موجودہ مذہب بھی اچھا ہے ان کے اوتار اور گرو بھی مسیح کی طرح قابلِ تعظیم ہستیاں ہیں تم کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تم یسوع مسیح کو واحد اور اکیلا نجات دہندہ مانو اور منواؤ اور اُس کو دوسرے گوروؤں نبیوں اور اوتاروں پر فضیلت دے کر اُن کو ادنیٰ اور اُس کو ایک اعلےٰ اور برتر ہستی مانو۔ تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح اور درست ہیں اور تمام مذاہب کے بانی یکساں طور پر واجب التعظیم ہیں ✣

مسیحی کلیسیا کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے اپنے رسالہ نور الہدیٰ میں ذکر کیا تھا کہ قرونِ اُولیٰ میں رومی سلطنت کے قیاصرہ نے بہتیرا زور مارا کہ مسیحیت دیگر مذاہب کے ساتھ میل جول اور مصالحت پیدا کرلے لیکن بالفاظِ مورخ ینگی "مسیحیت نے آتے ہی بہ صاف صاف کہہ دیا کہ اس کے سوا دُنیا کے تمام مذاہب باطل ہیں اور نجات صرف

اس کے پیروؤں کے لئے ہے" (تاریخ اخلاق یورپ جلد اوّل صہ ۳۲۹) اس عقیدہ کی وجہ سے مسیحیوں کو سر بکف ہونا پڑا اور سلطنت روم کی سرزمین تین سو سال تک ان کے خون سے متواتر لال ہوتی رہی لیکن اُنہوں نے قیصر کے حکم کے آگے سر نہ جھکایا۔ رُوم و یُونان و مصر کے دیوتاؤں اور خداوند مسیح کی شخصیت کو ایک ہی سطح پر نہ رکھا۔ بلکہ وہ ببانگ دُہل یہ اعلان کرتے رہے کہ دُنیا کی کوئی طاقت اُن کو اس شرمناک جھوٹ پر مجبور نہ کر سکے گی کہ تمام مذہب اپنی اپنی جگہ یکساں طور پر صحیح ہیں اور تمام ہادی یکساں طور پر واجب التعظیم اور قابلِ تقلید ہیں۔ مسیحی کلیسیا کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جہاں جہاں مسیحیت گئی ہر ملک و زمانہ میں اُس نے علی الاعلان یہ کہا کہ کلمتہ اللہ کی تعلیم بلند ترین ہے اور مسیحیت ہر مذہب پر غالب ہے۔ یسُوع مسیح دُنیا کا واحد اور اکیلا نجات دہندہ ہے جس کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کی تمام واجب التعظیم ہستیاں ایسی ہیں جیسی آفتاب عالم تاب کے سامنے آسمان کے ستارے اور اس صداقت پر مسیحی مبلّغین اور کلیسیا کے بے شمار افراد نے لاکھوں بلکہ کروڑوں دفعہ اپنے خون سے مُہر لگائی ؞

ہندوستان کے مذہبی پیشوا اور سیاسی لیڈر مختلف طریقوں سے وہی کوشش کر رہے ہیں جو اب تک بے سُود اور ناکام ثابت ہوئی ہے۔ وہ ہر ممکن طور پر اس بات کا پراپاگنڈا کر رہے ہیں کہ ہندوستان میں مسیحیت اور دیگر مذاہب کو یکساں تسلیم کر لیا جائے۔ کبھی وہ اِس بات کو ایک سودیشی اور قومی ضرورت بتلا کر اُن ہندوستانی مسیحیوں کو متاثر کرنا چاہتے ہیں جو سودیشی وطن اور قومیت کے شیدائی ہیں۔ کبھی وہ اس بات

کو ایک بدیہی حقیقت بتلاتے ہیں جو ایسی صریح ہے کہ اُس کے واضح کرنے کی بھی ضرورت نہیں اور یُوں جُہلا کے طبقہ کو اپنے دام میں پھنساتے ہیں بعض اوقات وہ اس بات کو فلسفیانہ دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یُوں اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہر طرح سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس گمراہ کن بات کو پھیلایا جائے کہ تمام مذاہب برابر ہیں۔ اور ان میں کوئی تفریق و تمیز نہیں پس ایک مذہب کو بدل کر دوسرے کو اختیار کرنا بڑے درجے کی حماقت ہے +

انشاءاللہ اس رسالہ میں ہم ان مختلف پہلوؤں پر بحث کرینگے۔ ہم غیر مسیحی لیڈروں کے مختلف دُعاوی کی تنقیح کر کے اُن پر تنقیدی نگاہ ڈالیں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ از روئے عقل ان میں صداقت ہے یا نہیں۔ ہم مسیحیت کے اصُول اور ادعائے مسیح کی روشنی میں ان کے دعاوی کو جانچیں گے تاکہ یہ معلوم کریں کہ ہم انجیل جلیل کی تعلیم کو مان کر اور خُداوند مسیح کے حلقہ بگوش ہو کر ان لیڈروں کی تعلیم کو تسلیم کر سکتے یا نہیں۔

دورِ حاضر کے ہندوؤں پر انجیل جلیل کی تعلیم کا اثر اس قدر ہُوا ہے کہ وہ اب مورتی پُوجا کو ترک کر بیٹھے ہیں اور ہندو رسوم و رواج کے قبیح اور اخلاق سوز پہلوؤں سے گریز کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اُن تمام باتوں کو خیرباد کہہ دیا ہے جو اس دھرم میں کم مایہ اور ادنیٰ اور ہیچ تھیں۔ چنانچہ پنڈت جواہر لعل نہرو فرماتے ہیں کہ "ہمارا مذہب قصابوں کا مذہب ہے۔ ہم اسی بات میں ہلکان رہتے ہیں کہ کس شے کو چھوئیں اور کس شے کو نہ چھوئیں۔ اشنان کرنے چٹیا رکھنے۔ ماتھے پر ٹیکا لگانے کی رسوم وغیرہ اب بے معنی باتیں رہ گئی ہیں۔ ہمارے دیوتا انگلستان اور جاپان کے کارخانوں

میں بنائے جاتے ہیں اور یہاں ہندوستان میں ہماری پوجا کیلئے اُن کی درآمد ہوتی ہے[1] لیکن ؎

نو نہ گردد کعبہ را رختِ حیات ‏ ‏ گر ز افرنگ آیدش لات و منات

کلمتہ اللہ کی تعلیم اور اصول کی روشنی میں ہندوؤں کے مختلف فرقے اپنے عقائد و رسوم کی دھڑا دھڑ اصلاح کر رہے ہیں۔ اب سے سو سال پہلے کے ہندو جب مسیحیت کی روشنی میں اپنے مذہب کو دیکھتے تھے تو وہ ان کو ایک نفرت انگیز اور گھنونی شے معلوم ہوتی تھی کیونکہ مسیحیت کے نُور کے مقابلہ میں وہ ایک تاریک شے تھی۔ لیکن دورِ حاضر کے ہندو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب کے عقائد اور رسوم کی اصلاح کر کے ہندو مت کے حلقہ میں رہ سکتے ہیں اور چونکہ ہندو حلقہ کے اندر ان کے عقائد کی نسبت اُن سے کسی قسم کی باز پُرس نہیں کی جاتی اور وہ اس کے دائرہ کے اندر رہ کر جو چاہیں مان سکتے ہیں لہذا وہ مسیحیت کے حلقہ بگوش ہونا نہیں چاہتے۔ چُونکہ یہ ایک اتفاق ہے کہ مسیحیت کے پرچارک انگلستان سے آئے تھے جو ہندوستان پر حکمران تھا لہذا مسیحیت کے دشمن مسیحیت کو ایک بدیشی مذہب کہہ کر قوم پرست ہندوؤں کو اس کے خلاف اُکساتے ہیں۔ ان تمام حالات کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ اصلاح شدہ ہندو مت مسیحیت کا جانی دُشمن ہو گیا ہے۔ ؎

کس نیاموخت علم تیر از من ‏ ‏ کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

چنانچہ پروفیسر رادھا کرشن صاحب ہندو مت اور مسیحیت کے تعلقات کی اس سیاسی رشتہ کے ساتھ تشبیہہ دیتے ہیں جو اب تک ہندوستان اور انگلستان میں رہا ہے۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ انگریزی راج کا پہلا زمانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے راج کا زمانہ تھا

1. New Era, Oct. 1928 p. 22

جب انگریز ہندوستانیوں کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے چنانچہ اُس زمانہ میں ہندومت کو ہیچ سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا زمانہ امپیریئل ازم یا شہنشاہیت کا زمانہ تھا جب انگریزی راج کی وجہ سے ہندوستانی انگریزوں کے ماتحت تھے اور انگریز اُن کے سرتاج تھے چنانچہ اس زمانہ میں ہندومت کو مسیحیت کے ماتحت سمجھا جاتا تھا اور مسیحی مذہب ہندومت کو کامل کرنے والا درخشاں تاج خیال کیا جاتا تھا۔ تیسرا زمانہ دورِ حاضر کا ہے جب ہندوستان کو برطانیہ کی اقوام کے خاندان کا ایک ممبر اور دونوں کو برابر سمجھا جاتا ہے۔ پس اب وقت آ گیا ہے کہ مسیحیت اور ہندومت دوش بدوش ہو کر ایک خاندان کے ممبروں کی طرح برابر قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جائیں جس طرح ہندو اس بات کے لئے تیار ہیں کہ مسیح کو ایک عظیم ترین اخلاقی اُستاد مان لیں اور رام یا کرشن یا شو کی طرح اُس کی بھی پُوجا کریں اسی طرح لازم ہے کہ مسیحی بھی ہندوؤں کی کتابوں کو بائبل کی طرح الہامی اور برحق مان لیں اور ان کے دیوی دیوتاؤں کی اپنے مسیح کی طرح قدر اور وقعت کریں +

لیکن انجیل جلیل کو ماننے والے اور خُداوند مسیح پر ایمان رکھنے والے ہرگز اس بات کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کی مذہبی رواداری کلمتہ اللہ کے نزدیک اور آپ کے رسُولوں کے نزدیک غلط ہے اور مسیحی کلیسیا کے نزدیک یہ روّیہ مسیح سے غدّاری کا روّیہ ہے اور اس کے انکار کرنے کے برابر ہونے کی وجہ سے ایک ناقابلِ معافی گُناہ ہے۔ خُداوند کی اور آپ کے مبلّغین کی یہ تعلیم نہ تھی کہ آپ دُنیا کے دیگر معلموں کی طرح ایک معلم ہیں بلکہ انجیل جلیل کی تعلیم کا تمام زور اس بات پر ہے کہ کلمتہ اللہ کا مکاشفہ

کامل اور اکمل ہے۔ منجئ عالمین کی نجات کامل کافی اور دائمی ہے اور مسیحیت کی طاقت اسی میں ہمیشہ مضمر رہی۔ جو سبق ہمارے ہندو بھائی ہندوستانی کلیسیا کو پڑھانا چاہتے ہیں اگر وہ درست اور صحیح ہوتا تو قرون اولیٰ میں جیسا کہ اپنے رسالہ نور الہدیٰ میں ذکر کر چکے ہیں مسیحیت بھی دیگر ادیان باطلہ میں سے ایک ہوجاتی اور شہادت کی نوبت نہ آتی بت پرست قیاصرۂ روم مسیحیت کو تباہ کرنے پر صرف اسی وجہ سے تلے تھے کہ کلیسیا مسیح کو وہ درجہ نہیں دیتی تھی جو بُت پرست مذاہب میں دیوی دیوتاؤں کا درجہ تھا۔ اُس میں عصبیت تھی اور یہ عصبیت مسیحیت کی زندگی کا باعث تھی اور اگر وہ اپنے اصُول پر قائم نہ رہتی تو وہ کب کی دیگر ادیان اور بُت پرست مذاہب میں جذب ہوگئی ہوتی۔ اور آج کے روز اُن مذاہب باطلہ کی طرح اس کا بھی صفحۂ ہستی سے نام و نشان مٹ گیا ہوتا۔ اسی طرح اگر ہندوستانی کلیسیا بُت پرست ہندوؤں کی آواز سُن کر اپنے خُداوند اور انجیل سے غداری کر کے ان کے اصُول پر قائم نہ رہیگی تو اس میں رتی بھر شک نہیں کہ وہ ہندو مذہب میں جذب ہوجائیگی اور ہندوستان سے اس کا نام و نشان مٹ جائیگا۔ لیکن اگر کلیسیا اپنے اصُول پر قائم رہی اور اُپنے ایمان کو تھامے رہی تو جس طرح آج کوئی شخص اوسیرس اور آئی سس۔ ڈمیٹر اور پرسی فونی۔ ایڈونس اور اطیس۔ ڈایونیسیس اور جوپیٹر اور دیگر مذاہب کفر کے دیوی دیوتاؤں کا نام نہیں جانتا کیونکہ مسیح ان سب پر فاتح رہا اسی طرح نزدیک کے مستقبل میں ہندو مذہب کے دیوی دیوتاؤں سے لوگ ناواقف ہوجائیں گے اور مسیح خُداوند سب پر فاتح رہے گا۔ کیونکہ حق اور باطل کی لڑائی میں حق بالآخر سب

پر غالب رہتا ہے خُداوند مسیح جوؔ راہ حق اور زندگی ہے سب پر غالب ہو کر رہے گا ۔

یہ رسالہ مختلف قسم کی مصروفیتوں کے دوران میں لکھا گیا ہے۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہؤا ہے کہ مَیں اس کے بعض حصص کے مضامین کو اس طرح ادا نہیں کر سکا جس طرح ان کا حق تھا۔ اس رسالہ کے بعض دلائل کو مَیں مفصّل طور پہ لکھنا چاہتا تھا لیکن عدیم الفرصتی نے یہ نہ ہونے دیا۔ پس بایں خیال کہ عاقل را اشارہ کافی است ان کو اسی حالت میں رہنے دیا۔ اگر مختلف ابواب میں بعض نکات دُہرائے گئے ہیں۔ تو بمصداق ؏

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

یہ مسوّدہ دو سال سے میرے پاس پڑا ہؤا ہے میرا خیال تھا کہ موقعہ پا کر اس کی نظرِ ثانی کر کے اس کی خامیوں کو رفع کر سکوں گا لیکن فرصت نہیں ملی پس مجبور ہو کر اس رسالہ کو اس کی موجودہ صورت میں پریس میں بھیج رہا ہوں ۔

میری دُعا ہے کہ اس رسالہ کے ذریعہ ہمارے ہم وطن راستی اور صداقت کو پہچانیں اور خُداوند مسیح پر ایمان لائیں تا کہ ہمارے ملک اور قوم کی دُنیاوی فلاح اور روحانی ترقی ہو ۔

پتوکی ۔ ضلع لاہور

۲۸ فروری ۱۹۴۱ء

برکت اللہ

باب اوّل

ہندو دھرم اور مذہبی رواداری

ہندو مت کی تعریف

ہندو دھرم اُن معنوں میں "مذہب" نہیں جن معنوں میں اسلام یا مسیحیت مذاہب ہیں۔ "دھرم" کا لفظ "مذہب" کا مترادف نہیں بلکہ اس کا مطلب "طبعی معمول" یا "دستور العمل" ہے مثلاً آگ کا دھرم جلانا ہے۔ کشتری کا دھرم لڑنا ہے۔ لیکن اسلام یا مسیحیت کے نقطۂ نگاہ سے "مذہب" اس رشتہ کا نام ہے جو خدا اور انسان کے درمیان ہے اور اس رشتہ کے امتیازی نشان کی وجہ سے اسلام اور مسیحیت کے چند مخصوص عقائد ہیں جن کو اسلامی یا مسیحی عقائد کہا جاتا ہے۔

لیکن چونکہ ہندو دھرم خدا اور انسان کے درمیانی رشتہ کا نام نہیں لہٰذا ہندو دھرم کے کوئی مخصوص عقائد بھی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو دھرم میں ہر قسم کے مختلف متفرق اور متضاد خیالات موجود ہیں۔ مثلاً اُس کے حلقہ کے اندر اگر ایک فرقہ ویدوں کو مانتا ہے تو دُوسرا اُن کو نہیں مانتا۔ ایک اُپنشدوں کو مانتا ہے تو دُوسرا نہیں مانتا۔ اگر ایک فرقہ خُدا کی وحدت کا قائل ہے تو دوسرا کروڑوں دیوتاؤں کو مانتا ہے۔ تیسرا خُدا کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ اگر قائلینِ رُوح ہندو ہیں تو منکرینِ رُوح بھی ہندو ہیں۔ مجسم حلول اتحاد اور اوتار کے ماننے والے ہندو ہیں تو نرگن ایشور کو ماننے والے بھی ہندو ہیں۔ وحدت الوجود کے ماننے والے بھی ہندو ہیں اور خُدا کے علاوہ رُوح اور مادہ کو بھی ازلی ماننے والے ہندو ہیں۔ اگر ایک گئو رکھشا کا قائل ہے تو دوسرا گائے کا گوشت کھاتا ہے۔ اگر ایک فرقہ ویدانت

خیالات کی پیروی کرتا ہے تو دُوسرا مادیت کا قائل ہے۔ اگر ایک شِو کی پُوجا کرتا ہے تو دوسرا کرشن کی پرستش کرتا ہے۔ ایک وشنو کے آگے ماتھا ٹیکتا ہے تو دوسرا کالی کے آگے سربسجود ہے۔ ان دیوتاؤں اور معبُودوں کی صفات میں اس قدر اختلاف ہے کہ خُدا کی پناہ۔ لیکن یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ہر شخص خُدا ہی کی پُوجا کرتا ہے چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن جی کہتے ہیں کہ:۔

"وہ جو اُدھر دیووں کی پُوجا کرتے ہیں وہ بھی میری ہی پُوجا کرتے ہیں" (۹/۲۳)

لیکن اگر بعض دیوتاؤں کی صفات کو نیک سمجھ کر ان کی پیروی کی جائے تو انسان بدترین خلائق بن جائے۔ غرضیکہ ہندو دھرم ایک گجلول ہے جس میں ہر طرح کے متفرق خیالات اور ہر قسم کے متضاد عقائد پہلو بہ پہلو رواداری اور مصالحت کے ساتھ ہزاروں برسوں سے رہتے چلے آئے ہیں۔ اگر ان میں کوئی مشترکہ شے ہے تو وہ کرم کا اصُول اور تناسخ کا مسئلہ ہے۔ ان دونوں عقیدوں کی تعلیم اُپنشدوں میں دی گئی ہے اور مابعد کا تمام ہندو فلسفہ ان دو باتوں کو صحیح اور راست مان کر ان کو اپنے مفروضات میں داخل کر لیتا ہے۔

چُونکہ ہندو مت کے کوئی مخصُوص عقاید نہیں ہیں لہٰذا ہر شخص اس مت کی منطقی تعریف کرنے سے قاصر ہے۔ بعض فضلاء کے نزدیک ہندو مت کی خصُوصیت ذات پات کی پابندی ہے۔ مسٹر گاندھی نے ایک مشنری سے دورانِ ملاقات میں کہا "میرے نزدیک لفظ "ہندوازم" لفظ "مذہب" کا مترادف ہے۔ جب آپ سے کہا گیا کہ فضلا کے نزدیک ہندوازم کی خصُوصیت ذات پات کی تمیز ہے جس امتیاز کے آپ قائل نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ تمیز ہندو مت کی خصُوصیت نہیں ہے بلکہ ہندوازم کی خصُوصیت اہمسہ

کی تعلیم ہے۔ مشنری نے کہا کہ اگر آپ کا قول درست ہے تو بدھ مت اور جین مت اور ہندو مت میں کیا فرق ہے کیونکہ بدھ مت نے اہمسہ کی تعلیم ہندوستان کے باہر غیر ممالک مثلاً چین و جاپان میں پھیلائی ہے"۔ (فیلوشپ بابت مئی ۱۹۳۶ء)

مسٹر گاندھی اہمسہ کو ہندو مت کی خصوصی تعلیم سمجھتے ہیں لیکن سر سوامی آر جیسا زبردست عالم اس نظریہ کی تردید کرتا ہے (ہندوستان ریویو بابت جنوری ۱۹۲۱ء) بھاگوت گیتا میں یہ تعلیم نہیں ملتی۔ بلکہ اس میں کرشن جی ارجن کو جنگ پر آمادہ کرتے ہیں۔ بفرض محال ہم تسلیم کر لیں کہ اہمسہ ہندو مت کی خصوصی تعلیم ہے تو جیسا اوپر ذکر ہوا اس مت کو ہم بدھ مت اور جین مت سے کس طرح امتیاز کر سکتے ہیں کیونکہ ان موخر الذکر مذہبوں کی بھی یہی خصوصی تعلیم ہے۔ ہندو مہا سبھا کا پریزیڈنٹ ڈاکٹر ساورکار کہتا ہے کہ:-

"ہندو وہ ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا ہے اور اس ملک کے کسی مذہب کا پیرو ہے" (ٹریبون لاہور، ۲ مارچ ۱۹۳۰ء)

لیکن اس قسم کی تعریف ان تمام امریکن انگریز اور دیگر غیر ہندی اشخاص کو ہندو مت کے حلقہ سے خارج کر دیتی ہے جو شدھی کے ذریعہ اس میں داخل کئے گئے ہیں بلکہ یہ تعریف خاص ہندو مت کے پیروؤں اور ہندوستان کے دیگر مذاہب کے پیروؤں میں تمیز نہیں کرتی۔ بعض کہتے ہیں کہ ہندو وہ ہے جو چار ذاتوں میں سے کسی ذات کے اندر پیدا ہوا ہو۔ لیکن موجودہ زمانے کے ہندو ذات پات کی تمیز کو مٹانے کے درپے ہو رہے ہیں بعض کہتے ہیں کہ ہندو وہ ہے جو اپنے آپ کو ہندو کہے جس کا مطلب

یہ ہے کہ اصولِ منطق کے مطابق لفظ "ہندو" کی تعریف ایک امر محال ہے۔

ہندو مت کا دائرہ گویا ایک چڑیا خانہ کی طرح ہے جہاں ہر قسم کے جاندار جو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوتے ہیں جمع کئے جاتے ہیں اور ہندو مت کے حلقہ بگوش متناقض اور متضاد خیالات کو جو ہندو مت کے اندر جمع ہیں مانتے ہیں۔ جس طرح چڑیا گھر میں شیر بکری کا اور عقاب چڑیا کا نقصانِ جان نہیں کر سکتا اسی طرح وہ سمجھتے ہیں کہ متضاد خیالات ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر ہو کر رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ملک کے مایۂ ناز فلاسفر سر رادھا کرشن جو ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں کہتے ہیں کہ:-

"ہندو مذہب خدا کے مختلف تصورات میں سے کسی ایک تصور کو حق یا باطل قرار نہیں دیتا۔ اور نہ کسی ایک تصور کو کل بنی نوع انسان کے لئے قطعی معیار تسلیم کرتا ہے۔ ہر شخص کو یہ حق دیا گیا ہے کہ جو تصور اور طریقۂ عبادت اس کو پسند آئے وہ اسی کو اختیار کرے"۔[1]

بقول شخصے ؎

در حیرتم کہ دشمنیٔ کفر و دیں ز چیست
از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

ہندو مت اور عبادت کی علت غائی

پس ہندو دھرم میں درحقیقت کوئی عقائد نہیں جو ہندو مت کے ساتھ مخصوص ہوں چنانچہ ہندو مت کو اس بات پر ناز بھی ہے کہ وہ کسی خاص عقیدہ کے ساتھ وابستہ نہیں ہے ایک مصنف نے

1. Hindu View of Life, pp. 31, 32, 46

اس مت کا نام رکھا ہے Nameless of a Hnndred Names
یعنی "جس کے سو نام ہے اور پھر بھی نام نہیں رکھتا"۔ پس اس کا دائرہ محدود نہیں ہر شخص اس کے حلقہ میں رہ کر جو چاہے مان سکتا ہے کوئی اس سے تعرض نہیں کرسکتا۔ ہندو مت کا تعلق نہ تو کسی عقیدہ کے ساتھ ہے اور نہ اس کے دھرم کی بنیاد کسی ایک تاریخی شخص پر قائم ہے۔ چنانچہ سوامی دیویکانند کہتا ہے کہ تمام مذاہب میں ہندو مذہب ہی ایک ایسا مذہب ہے "جس کا جہاز تاریخ کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش نہیں ہوتا"۔ چونکہ تاریخ اور زمان و مکان کے تعلقات محض مایا ہیں لہذا خدا کا کامل مکاشفہ زمان و مکان کی حدود کے اندر نہیں ہو سکتا پس ہندو کہتے ہیں کہ اس بات کا خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ہمارے اوتار تواریخی شخص تھے یا نہ تھے اور ان کے قصص تاریخ اور حقیقت پر مبنی ہیں یا محض افسانے اور انسانی تخیل کا نتیجہ ہیں۔ مذہب کا کام عبادت گذاروں کے جذبات کو مشتعل کرنا ہے خواہ کسی وسیلے سے کئے جائیں۔ ع

ہم کو تو دل لگی سے غرض ہے کہیں سہی　　گر تو نہیں تو اور کوئی مہ جبیں سہی

اگر ہم اپنے جذبات کو کالی یا کرشن یا وشنو یا مسیح کی پرستش سے بھڑکا سکتے ہیں تو یہ بس ہے۔ ہم پر یہ لازم نہیں کہ عقل کے ذریعہ کالی کی صفات یا کرشن کے کارناموں کی تنقیح و تنقید کریں یا دریافت کرتے پھریں کہ کرشن یا رام یا محمد یا مسیح کوئی تواریخی شخص تھے یا نہیں۔ چنانچہ سوامی دیویکانند اقرار کرتے ہیں کہ کرشن کوئی تواریخی شخص نہ تھا۔ لیکن اس پر بھی وہ کرشن کو کامل ترین اوتار مانتے ہیں اور ان دو باتوں کے ماننے میں ان کو کوئی ناموافقت نظر نہیں آتی ۔

علیٰ ہذا القیاس مسٹر گاندھی مسیحی گیتوں میں سے ذیل کا گیت سب سے زیادہ گاتے ہیں :-

صلیب پر جب میں کرتا دھیان	جس پر ہے مُوا رب آلنور
تو نفع گنتا ہوں نقصان	حقیر میں جانتا ہوں سب غرور
نہ ہو کہ مجھے فخر ہو	مگر صلیب پر یسوع کی
دنیا کی شان و شوکت کو	چھوڑ دوں گا خاطر یسوع کی
دیکھ اس کے پانچوں زخموں سے	ہے جاری غم اور پیار کی دھار
کیا کبھی دیکھا کانٹوں سے	تاج بنا ایسا رونق دار؟
گر نذر کروں کل جہان	تو تیرے لائق نہیں ہے
تو چاہتا میرا دل اور جان	سو سدا تیرے پیار کی جے
مسیح کے دُکھ اُٹھانے سے	بچ گئے سارے آدم زاد

اب اُس کے خون خریدوں سے
ہو اُس کی حمد ابد الآباد

لیکن اس قسم کے گیت کے بعد ہی آپ ہندو دیوتاؤں کے گیت گاتے ہیں اور دونوں قسم کے گیتوں میں بنیادی اختلاف مغائرت اور ناموافقت یا غیر مطابقت نہیں دیکھتے۔ ہندوؤں کے نزدیک خدا ایک ایسی ہستی ہے جو صفات سے معرا اور بالا ہے لہذا اُن کو یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ جس شے سے اُس کو تشبیہ دیتے ہیں وہ مناسب ہے یا غیر موزوں ہے۔ چونکہ پرماتما کی ذات کو وہ جان نہیں سکتے لہذا اُن کے لئے یکساں ہے خواہ اس کو مسیح یا کرشن یا شیو یا رام یا کالی کہا جائے۔ تمام مذاہب جذبات کو مشتعل کرنے میں ممد و معاون ہیں لہذا تمام مذاہب یکساں طور پر

برحق ہیں ۔

لیکن عقل سلیم تو یہ تقاضا کرکے پوچھتی ہیں کہ آخر یہ دیوتا جن کی ہندو پرستش کرتے ہیں کیا ہیں اور کون ہیں ان کی ذات اور صفات حقیقت کے معیار پر پوری اُترتی ہیں یا کہ نہیں؟

(۲)

ہمارے ہندو برادران کے خیال کے مطابق مذہب کی غایت عابد کے جذبہ کو بھڑکانا ہے خواہ وہ ایک حقیقی تواریخی ہستی کے ذریعہ جو اس دُنیا میں ہماری طرح کا انسان تھا بھڑکایا جائے خواہ ہم انسانی تخیل اور فسانوں سے کام لے کر اس مقصد کو پُورا کریں۔ لیکن ہم اپنی روحانی زندگی کو محض خیالی وجود قصے داستان یا محض افسانہ پر قائم نہیں کر سکتے۔ اگر ہمارے ایمان کی جو خدا پر ہے بنیاد صرف انسانی تخیل پر ہے تو ظاہر ہے کہ ایک نامعلوم غیر تواریخی شخص سے خیالی محبت ایک نہایت نامعقول بنیاد ہے جس پر ایمان کی محکم عمارت ہرگز قائم نہیں ہو سکتی۔ کوئی شخص کسی نامعلوم ہستی رکھنے والی عورت سے مجنونانہ خیالی محبت رکھ کر اپنے گھر اولاد خاندان کی بُنیاد قائم نہیں کر سکتا۔ ایسے شخص پر تمام دُنیا ہنسے گی لیکن ہم حیران ہیں کہ رُوحانی امُور میں سلیم الطبع اشخاص اس قسم کی مضحکہ خیز باتیں کس طرح تسلیم کر لیتے ہیں؟ ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست۔

(۳)

علاوہ ازیں جذبات کی مختلف اقسام ہیں۔ جو جذبہ رادھا کو کرشن کے ساتھ تھا وہ نفسانی خواہشات کی طرح کا جذبہ ہے اس قسم کے جذبہ میں اور مسیحیت کے مسیح کی محبت میں زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں

صرف وہی شخص تمیز کرنے سے قاصر رہے گا جو علم و دانش سے بالکل بے بہرہ ہے ؎

حقیقت حُسن کی ان کے نہ پُوچھے کوئی مجھ سے
کہ سیاہ فام چہرے پہ غازہ ملا ہُوا ہے

(۴)

پس یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ مختلف مذاہب کے پرستاروں کے روحانی تجربات مختلف ہوتے ہیں۔ "ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت بُرا پھل نہیں لا سکتا اور بُرا درخت اچھا پھل نہیں لا سکتا" (لوقا ۶: ۴۳) مذہب کے جس قسم کے اصُول ہوتے ہیں پرستاروں کے رُوحانی تجربات جذبات اور افعال بھی اُسی قسم کے ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ملحد کا تجربہ اور ایک بُت پرست کا تجربہ اور ویدانتی کا رُوحانی تجربہ (جو دُنیا کو مایا خیال کرتا ہے اور اپنے آپ کو خدا مانتا ہے) اور ایک مسیحی خدا پرست کا روحانی تجربہ چاروں یکساں طور پر درست اور راست نہیں ہو سکتے کیونکہ ان جذبات میں باہمی تضاد اور تناقض ہے۔ پس جب اثرات مختلف اور متضاد ہیں تو ان اثرات کے علل اور اسباب یعنی مختلف مذاہب کے اصُول کس طرح یکساں طور پر صحیح۔ درست اور راست تسلیم کئے جا سکتے ہیں؟ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ:-

ع گندم از گندم بروید۔ جَو ز جَو

جس طرح مختلف بیجوں سے مختلف پیداواریں حاصل ہوتی ہیں اُسی طرح مختلف مذاہب کے اصُول سے مختلف قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مختلف اعمال اور افعال سرزد ہوتے ہیں۔ مختلف مذاہب

کے پیروؤں کی ذہنیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ ع
جمال ہمنشیں در من اثر کرد۔ پس ہم کو منطقی مغالطات اور عقلی محالات سے بچنا چاہیئے
اور اس امر کو تسلیم کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیئے کہ مختلف مذاہب یکساں طور
پر حق صحیح درست اور راست ہرگز نہیں ہو سکتے ÷

(۵)

چونکہ ہندومت اور مسیحیت کی عبادت کے جذبات میں فرق ہے
لہذا خداوند مسیح کے حلقہ بگوشوں کے روحانی تجربہ میں اور بت پرست مذاہب
کے پیروؤں کے روحانی تجربہ میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر تم روئے
زمین کے مذاہب کی تاریخ کی ورق گردانی کرو تو تم کو اس اونچائی کا روحانی
تجربہ کہیں نہ ملیگا۔ مسیحی روحانی تجربہ کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ اس کے
تجربہ کرنے والوں نے اپنی گرانمایہ عمروں کو خلق خدا کی خدمت میں صرف
کر دیا۔ کس مذہب کی تاریخ میں تم کو بنی نوع انسان کی بے ریا خدمت
کرنے والوں کے گروہوں کے گروہ ملیں گے جن کی زندگی کا واحد مقصد بدنصیب
درماندوں مظلوموں اور بے کسوں کی چارہ سازی اور خدمت گذاری ہو؟
اپنے وطن ہندوستان کو لے لو کس مذہب نے ہمارے ملک کے بے کسوں
کے لئے مسیحی کلیسیا کی مانند اس قدر ہسپتال سکول کالج اور بیوہ خانے
یتیم خانے وغیرہ کھول رکھے ہیں؟ مسیحیت کے سوائے کس مذہب نے ہمارے
وطن کی گری ہوئی بدکار عورتوں کو سنبھال کر ان کو اس قابل بنایا ہے کہ
وہ از سر نو زندگی بسر کر سکیں؟ کس مذہب نے مسیحیت کی مانند جرائم پیشہ
قبائل کو از سر نو انسان بنا دیا ہے؟ مسیحیت کے علاوہ کس مذہب نے
کوڑھیوں کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے؟ ہندومت نے انیس کروڑ اقوام

کو اچھوت اور ناپاک قرار دے کر صدیوں تک اُن کو حیوان سے بدتر حالت
میں رکھا۔ اسلام نے ایک ہزار سال میں ان بدقسمت لوگوں کی حالت میں
کوئی نمایاں فرق نہ دکھایا۔ ہندومت کے عقاید نے ان کی زندگی کے نخل
کو مار دیا کیونکہ ان میں بطالت کا زہر موجود ہے۔ لیکن مسیحیت کے عقاید
نے اپنے مقلدین میں ان بدنصیبوں کی فلاح اور بہبودی کی تڑپ ڈال
دی۔ اور پچاس سال کے اندر اندر ان میں سے لاکھوں کو جو حیوان تھے
از سر نو انسان بنا دیا اور ذات پات کی تباہ کن امتیازات کو یکسر مٹا کر سب
کو خدا کا فرزند مسیح کا عضو اور خدا کی بادشاہی کا وارث بنا دیا ÷

(۶)

ہندومت میں پرماتما صفات سے معرا ہے اور دیوتاؤں کو پرماتما
کا مظہر اور اوتار مانا جاتا ہے لیکن جب ہم ان دیوتاؤں کی صفات پر نظر
کرتے ہیں تو وہ ایسی مخرب اخلاق ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو ہر
انسان چاہ ضلالت میں گریگا۔ کرشن کے جس تصور نے اہل ہنود کے
عوام الناس کے دلوں کو موہ رکھا ہے وہ بھاگوت گیتا کا کرشن نہیں ہے
جو فلسفیانہ درس دیتا ہے بلکہ پرانوں کا کرشن ہے جو بندرابن کے جنگلوں
میں گوپیوں کے ساتھ لیلا کرتا تھا اور اس تصور نے عوام الناس کے دلوں
میں گھر کر رکھا ہے۔ لاکھوں گیت اس تصور کے گواہ ہیں جو زبان زد
خاص و عام ہیں اور ہولی کا تہوار ہر سال ہم کو اس تصور اور لیلا کی یاد
دلاتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ وہ جو گوپیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اس بات
کی صلاحیت نہیں رکھ سکتا کہ گنہگار انسان کو گناہ کے آہنی پنجہ سے چھٹکارا
دے سکے۔ پس ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تمام مذاہب برابر طور پر عبادت

گزاروں کے جذبات کو مشتعل کر سکتے ہیں۔ بفرض محال اگر مذہب کا واحد کام جذبات کو برانگیختہ کرنا ہی ہو تاہم اس کے وسائل کے مراتب و درجات میں بعد المشرقین ہے۔ اندریں حالات ہم تمام مذاہب کو یکساں طور پر کس طرح برحق قرار دے سکتے ہیں؟

(۷)

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عبادت میں اصلی شے عابد کا جذبہ ہے اور ہم کو اس بات کی پروا نہیں کرنی چاہئے کہ یہ جذبہ کس شے سے ظہور پذیر ہوتا ہے ان کو ہم مرحوم لارڈ مارلے کے خیالات سے تعارف کرانا چاہتے ہیں جو خدا کی ہستی کے قائل نہ تھے۔ مرحوم کہتے ہیں

اس قسم کے خیال سے لوگ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور بعض ہمارے ہم عصر بھی اس قسم کی دلیل سے اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو یقین دلا لیا ہے کہ مذہبی جذبہ کی زندگی اعلیٰ ترین قسم کی زندگی ہے جس کا نہ عقل کے ساتھ تعلق ہے اور جس میں نہ تاریخ کا دخل ہے لیکن انسان کی روحانی زندگی کو نہ صرف جذبہ کی ضرورت ہے بلکہ صحیح رہنمائی اور ہدایت کی بھی ضرورت ہے۔ ہماری اندرونی زندگی کو نہ صرف جذبات کی طاقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ضمیر کی روشنی کی اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ جذبہ کی ہدایت اور ضمیر کی روشنی صرف عقل کے نور کے وسیلے حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ عقل اپنا نور تب ہی عطا کر سکتی ہے جب اس کا آزادانہ استعمال کیا جائے۔ پر اگر وہ متضاد قضایا کو برابر طور پر صحیح مانا جائیگا تو عقل کس طرح آزادانہ کام کریگی۔ ایسے انسان کے لئے امید ہو سکتی ہے جو دلیرانہ طور پر اس نتیجہ پر قائم رہنے کا عزم بالجزم کرلے جو صغریٰ اور کبریٰ قضایائے علم منطق

کے قوانین کے مطابق نکلتا ہے۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ جو شخص حق کے ساتھ کھیلتا ہے خواہ وہ کسی ارادے اور نیت سے ایسا کرتا ہو وہ انسانی ترقی کی زندہ طاقتوں کے ساتھ کھیلتا ہے" ❖

John Morley, On Compromise, Chapter 3

پس اگر ہم مذہب کے معاملہ میں صرف جذبات کو ہی دخل دیں اور عقل کو خارج کر دیں تو ہم بقول مرحوم مارلے "انسانی ترقی کی زندہ طاقتوں کے ساتھ کھیلتے ہیں"۔ لیکن اگر کوئی ہندوستانی اس قسم کا وطیرہ اختیار کرتا ہے اور ہندوستانی قوم کی زندہ طاقت کے ساتھ کھیلنے کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ حقیقت میں اپنے ملک اور قوم کے ساتھ غداری کرتا ہے ❖

(۸)

جہاں تک مسیحیت کا اس سوال سے تعلق ہے یہ مذہب ہندو دھرم کے مختلف فرقوں کی طرح ایک فرقہ یا مت نہیں ہے۔ ہم خداوند مسیح کی اس طریقہ اور انداز سے پوجا نہیں کرتے جس طرح ہندو بت پرست بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ بلکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ خدا کامل طور پر مسیح اور صرف مسیح میں ظاہر ہوا ہے۔ پس اس کے سامنے باقی تمام نام نہاد اوتار اور مظہر ناقص غیر مکمل اور ہیچ ہیں۔ مسیح اور صرف مسیح خدا کا حقیقی اور کامل مکاشفہ ہے پس اس پر ایمان رکھنا خدا پر ایمان رکھنا ہے اور خدا پر ایمان رکھنا مسیح پر ایمان رکھنا ہے۔ اصلی اور بنیادی سوال یہ ہے کہ خدا کیا ہے اور اس کا حقیقی مکاشفہ کس وسیلے سے ہوا ہے؟ ہندو دھرم کہتا ہے کہ خدا کو ہم جان نہیں سکتے۔ کالی اور کرشن۔ رام اور شو۔ مسیح اور بدھ سب یکساں طور پر اس کو ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر

رادھاکرشن اپنی کتاب "ہندو ویو آف لائف" میں سنسکرت کے ایک شلوک کا ذکر کرتے ہیں جس میں لکھا ہے :-

"ہری جو تینوں جہانوں کا حاکم ہے جس کو شیومت والے "شیو" کے نام سے اور ویدانتی "برہما" کے نام سے اور بدھ مت والے "بدھ" کے نام سے اور نیائکی "عامل" یا چیف ایجنٹ کے نام سے اور جین مت والے "آزاد شدہ" کے نام سے اور رسوم پرست "قانون کا اصل" کہہ کر پکارتے ہیں ہماری دعاؤں کو سنے۔" (صفحہ ۲۶)

لیکن عقل سلیم ہم کو بتلاتی ہے کہ خدا برابر طور پر کالی اور کرشن۔ رام اور شیو۔ مسیح اور بدھ میں ظاہر نہیں ہوا کیونکہ ان کے اوصاف اقوال و افعال ایک دوسرے سے کلیتہً مختلف و متضاد ہیں پس یا وہ کالی میں ظاہر ہوا ہے یا مسیح میں ظاہر ہوا ہے۔ یا وہ بدھ میں ظاہر ہوا ہے یا مسیح میں ظاہر ہوا ہے یا وہ رام میں ظاہر ہوا ہے یا مسیح میں ظاہر ہوا ہے۔ یا وہ کرشن میں ظاہر ہوا ہے یا وہ مسیح میں ظاہر ہوا ہے۔ پس اگر ہم خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو کالی اور مسیح دونوں میں برابر طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ رام اور مسیح دونوں میں نہیں دیکھ سکتے۔ کرشن اور مسیح دونوں میں یکساں طور پر خدا کا کامل مکاشفہ ہونا ایک محال عقلی ہے کیونکہ ان کے اوصاف جداگانہ ہیں پس یا تو مسیح خدا کا کامل مکاشفہ ہے یا کرشن خدا کا کامل مکاشفہ ہے۔ دونوں کا خدا کا کامل مکاشفہ ہونا اجتماع الضدین ہے۔ چونکہ انجیل کے مطالعہ سے ہماری عقل ہم کو بتلاتی ہے کہ خداوند مسیح خدا کا کامل مکاشفہ ہے لہٰذا ہم یہ مانتے ہیں کہ :-

"کسی دوسرے کے وسیلے سے نجات نہیں کیونکہ آسمان کے نیچے بنی آدم کو کوئی دوسرا نام نہیں دیا گیا جس کے وسیلے سے ہم نجات پا سکیں" (اعمال ۴ : ۱۲)

(۹)

مسیحیت اپنے اوائل زمانہ میں مذاہب باطلہ پر غالب آئی کیونکہ اس کا ایمان ایک تواریخی ہستی پر تھا۔ موجودہ ہندو مصلحین کی طرح اس زمانہ کے بت پرست پنڈت اپنے دیوی دیوتاؤں کے بیہودہ اور واہیات قصص کو تمثیلی رنگ میں پیش کیا کرتے تھے اور اس قسم کی تاویلی تفسیر کرکے اپنے پیرووں کے لئے اخلاقی سبق نکالتے تھے۔ لیکن ہر زمانہ کے سلیم الطبع اشخاص کی اخلاقی حس اس قسم کی پادر ہوا تاویلات سے بغاوت کرتی ہے اور یہی حال ہمارے ملک کے روشن طبع نوجوانوں کا ہے۔ انسانی روح اپنے ہی تخیل پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک تواریخی ہستی کی خواہاں ہے جو اس کا حقیقی نصب العین ہو سکے۔ ہندو مت کے پاس اس قسم کی کوئی تواریخی ہستی نہیں ہے۔ لیکن مسیحیت کا بانی ایک حقیقی تواریخی شخص تھا۔ ہندو مت اور دیگر بت پرست مذاہب کے اوتار انسانی قوت متخیلہ کا نتیجہ ہیں پس وہ محض وہمی صورتیں اور ظہور ہیں لہٰذا ان میں اور خداوند مسیح میں بیّن تفاوت ہے اور یہ فرق محض درجہ کا نہیں کہ کوئی کہہ سکے کہ فلاں دیوتا مسیح سے کم روحانی ہے اور مسیح فلاں دیوتا مثلاً کرشن وغیرہ سے زیادہ بڑا ہے۔ یہاں "کم" اور "زیادہ" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ دونوں میں درجہ کا فرق نہیں بلکہ حد اور قسم کا فرق ہے۔ خداوند مسیح ایک اور ہی قسم کی شخصیت رکھتا ہے۔ کرشن اور مسیح میں نوع اور قسم کا فرق ہے۔ پس مسیح نے ہر ملک اور زمانہ کے بے شمار افراد کے دلوں کو مسخر کر رکھا ہے۔ اہل ہند بھی اس سے مستثنےٰ نہیں چنانچہ مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ :-

"مسیح میرے دل میں دُنیا کے عظیم الشان معلموں میں سے ایک کی جگہ رکھتا ہے اور اس نے میری زندگی کو بہت متاثر کیا ہے"[1]

لیکن عقلِ سلیم خُداوند مسیح کو دُنیا کے دیگر معلموں نبیوں۔ معبودوں اور دیوتاؤں کی قطار میں شمار نہیں کر سکتی۔ اور نہ مسیحیت کی نسبت یہ کہہ سکتی ہے کہ جس طرح دیگر مذاہب اندھیرے میں ٹٹولتے پھرتے ہیں اسی طرح وہ بھی شب کی تاریکی میں خُدا کو ٹٹولتی پھرتی ہے۔ ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ خُداوند مسیح خدائے واحد کا قطعی۔ آخری۔ کامل۔ اکمل اور لاثانی مکاشفہ ہے۔

کیا کُل مذاہب ایک خُدا کی طرف جانے کے راستے ہیں

جو اصحاب اس اصُول کی تبلیغ کرتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں ہیں وہ بالعموم عوام الناس کے سامنے یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ مختلف مذاہب مختلف راستوں کی طرح ہیں جو ایک ہی شہر کی طرف جاتے ہیں جس طرح ہر راہ ایک ہی شہر کی جانب لے جاتی ہے اُسی طرح ہر مذہب ایک ہی خُدا کی طرف لے جاتا ہے۔ جس طرح چلنے والا جس راہ کو چاہے اختیار کر لے اسی طرح ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کر لے۔ وہ کہتے ہیں کہ موٹی سے موٹی عقل والا شخص بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ خُدا ایک ہی ہے اُس کو ایک شخص پرمیشور کہتا ہے تو دوسرا اُسی کو واہگرو کہتا ہے۔ کوئی اس کو اللہ کہتا ہے کوئی برہما اور کوئی اس کو خُدا کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ غرضیکہ ہستی ایک ہی ہے جس کی سب پرستش کرتے ہیں۔ صرف اُس

[1] Andrews, Mahatma Ghandi's Ideas, p. 92

ایک ہستی کے نام مختلف ہیں اور نام کی نسبت جھگڑنا کسی عقلمند کا کام نہیں۔

؎ وہی جا پہنچتی ہیں کعبہ کو زاہد بکلتی ہیں راہیں جو کوئے بتاں سے

چنانچہ مسٹر گاندھی کہتے ہیں :-

"خُدا کے ہزاروں نام ہیں بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس کا کوئی خاص نام نہیں۔ ہم کو یہ اختیار ہے کہ جس نام سے چاہیں اس کو پکاریں۔ بعض اس کو رام کہتے ہیں بعض اس کو کرشن کہتے ہیں بعض اس کو خُدا کہتے ہیں لیکن سب ایک ہی رُوح کی پرستش کرتے ہیں۔ جس طرح تمام غذائیں ہر شخص کو مرغوب نہیں ہوتیں اسی طرح خُدا کے سب نام ہر شخص کو پسند نہیں ہوتے لیکن ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جو نام اس کو پیارا لگے وہ اختیار کر لے چونکہ وہ علیم وخبیر ہے اور ہماری دلی آرزوؤں سے واقف ہے پس وہ ہماری دعاؤں کا جواب بھی دیتا ہے"۔ (ہندو ویو آف لایف صہ ۳۴)

جنوبی ہند کا ایک ہندو شاعر کہتا ہے "جس طرح ہر پہاڑی ندی مختلف اطراف سے ایک ہی سمندر میں گرتی ہے لیکن ہر ندی کے مختلف نام ہوتے ہیں اُسی طرح ہر مُلک کے انسان ایک ہی خُدائے کبیر و عظیم کے حضُور جھکتے ہیں گو وہ اُس کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں" (ایضاً صہ ۳۴)

ایک اور ہندو مصنف لکھتا ہے کہ جس طرح مختلف رنگ کی گائے ہوتی ہیں کوئی کالی ہوتی ہے کوئی سفید۔ کوئی لال اور کوئی بھورے رنگ کی ہوتی ہے لیکن ہر رنگ کی گائے کا دودھ ایک ہی رنگ کا ہوتا ہے اسی طرح مختلف اقوام کے لوگوں کے دیوتا بظاہر مختلف ہوتے ہیں لیکن درحقیقت پرستش اسی ایک خُدا کی ہوتی ہے ؎

ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار چہ مست ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

(۱)

مذکورہ بالا نظریہ بظاہر نہایت دلکش اور صُلحِ کُل معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر یہ نظریہ عقل کے معیار پر پُورا اُتر سکے تو ہم کو اس کے ماننے میں ذرا تامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب ہم مثال کی تہ کو پہنچتے ہیں تو اس کی خامی ہم کو نظر آتی ہے۔ از روئے منطق کوئی مثال عقلی دلیل کی جگہ نہیں لے سکتی پس ہر عقیل شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش کریگا کہ آیا مذکورہ بالا مثالیں مضمون زیر بحث پر صادق بھی آتی ہیں یا نہیں۔ کیا یہ بات درست ہے کہ مختلف مذاہب میں صرف خُدا کے نام کی نسبت فرق ہے اور بس؟ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ تمام مذاہب خُدائے واحد کے قائل نہیں اور اگر بفرضِ محال ہم یہ مان بھی لیں کہ تمام مذاہبِ عالم ایک ہی خُدا کی ہستی کے قائل ہیں تو ان میں ذاتِ الٰہی کے تصورات کے متعلق اختلاف ہے اور یہ اختلافات محض سطحی اور ظاہری نہیں بلکہ بنیادی اور اصُولی اختلافات ہیں جو کسی صُورت بھی از روئے اصُولِ منطق و فلسفہ ایک دوسرے سے منطبق نہیں کئے جا سکتے۔ ہم آگے چل کر انشا اللہ اس پر مفصّل بحث کریں گے۔ یہاں یہ کہہ دینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص ویدوں کے پرمیشور کو مانتا ہے وہ ایک ایسی ہستی کا قائل ہے جس کو وہ شخص نہیں مان سکتا جو قرآن کے اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اور جو شخص قرآن کے اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ ایک ایسی ہستی پر یقین رکھتا ہے جس کو وہ شخص قبول نہیں کر سکتا جو انجیل کے خدا کو مانتا ہے۔ پس یہ قول بالکل غلط ہے کہ ہر شخص ایک ہی ہستی کو مانتا ہے جس کے نام مختلف ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف محض ناموں کا نہیں بلکہ

ذات و صفات کا اختلاف ہے جو بُنیادی اور اصُولی ہے۔ قرآن کے اللہ کی پرستش کرنے والا ویدوں کے پرمیشور کی ذات و صفات رکھنے والی ہستی کی پرستش نہیں کر سکتا اور انجیل کے خُدا پر ایمان لانے والا قرآن کے اللہ کی ذات و صفات کو ناقص اور غیر مکمل قرار دیگا لہٰذا وہ اس کی پرستش نہیں کر سکتا پس یہ بات غلط ہے کہ سب مذہب والے ایک ہی ہستی کی پرستش کرتے ہیں ÷

(۲)

مختلف راستوں کی جو مثال ہمارے مخاطب دیتے ہیں وہ بھی مذاہب پر صادق نہیں آ سکتی۔ کیونکہ یہ مثال فرض کر لیتی ہے کہ خُدا کسی پہاڑ یا شہر کی طرح ایک جگہ قائم اور ساکن ہے اور اس کی ذات کسی شہر کی طرح غیر متحرک غیر ارادی اور غیر متشخص ہے اور جس طرح مختلف لوگ مختلف راستوں سے کسی شہر میں پہنچ جاتے ہیں اُسی طرح مختلف اقوام و ممالک مختلف راستوں اور طریقوں سے خُدا کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق خُدا شہر کی طرح ساکن رہتا ہے اور کُل ممالک و اقوام کے انسان اپنی کوشش سے خُدا کے پاس آتے ہیں اور جس طرح شہر کسی کے پاس چل کر نہیں جاتا اسی طرح خُدا اپنی طرف سے انسان کی نجات کے لئے کسی قسم کی کوشش نہیں کرتا۔ مگر یہ بات بدیہی طور پر غلط اور بے بنیاد ہے کہ خُدا انسان کی نجات کے لئے کچھ نہیں کرتا اور کسی شہر یا پہاڑ کی طرح بے بس اور کسی فعل مجہول کی طرح مظہر مفعولیت مسند الیہ ہے۔ خُدا نہ صرف ہمارا خالق اور پروردگار ہے بلکہ انجیل جلیل کی تعلیم کے مطابق وہ بنی نوع انسان کا باپ ہے جس کی ذات محبت ہے جس

کا یہ خاصہ نہیں ہوتا کہ غیر ارادی اور غیر مشخص ہو بلکہ محبت سے ارادہ اور فعل دونوں صادر ہوتے ہیں۔ خدا کے یہ شایاں نہیں کہ اپنے گمراہ بیٹے کو صراط المستقیم پر لانے کی جانب سے بے نیاز ہو کر لاپرواہی اختیار کرے بلکہ اس کی پدری محبت ہر ممکن طور پر جد و جہد کرتی ہے کہ اس کا گم گشتہ فرزند چاہِ ضلالت سے نکلے۔ اور یہ پدری محبت اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لئے ہر طرح کا ایثار کرنے کو تیار رہتی ہے۔ اور اس کو چین نصیب نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائے۔ پس مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ خدا اپنے فضل کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اور اس کی لازوال پدری محبت ایثار سے پیش قدمی کر کے گنہگار انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ پس انسان اپنی ذاتی کوشش سے خدا کی طرف نہیں آتا بلکہ خدا کی ابدی محبت اس کو بلاتی ہے۔ انسان اپنے ذاتی اعمال سے نجات نہیں پاتا تاوقتیکہ پہلے خدا کا فضل اس کے شامل حال نہ ہو۔ اس سے پیشتر کہ انسان خدا کی تلاش کرے۔ خدا انسان کی تلاش کرتا ہے۔ یہ واضح حقیقت مسیحیت کا اصل ہے چنانچہ لکھا ہے :۔

"خدا محبت ہے۔۔۔ جو محبت خدا کو ہم سے ہے وہ اس سے ظاہر ہوئی کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تاکہ ہم اس کے سبب سے زندہ رہیں۔ محبت اس میں نہیں کہ ہم نے خدا سے محبت کی بلکہ اس میں ہے کہ خدا نے ہم سے محبت کی اور ہمارے گناہوں کے کفارہ کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا (۱ یوحنا ۴: ۸-۱۰)

"روح القدس جو ہم کو بخشا گیا ہے۔ اس کے وسیلے سے خدا کی محبت ہمارے دلوں میں ڈالی گئی ہے کیونکہ جب ہم گنہگار ہی تھے تو عین وقت پر

مسیح بے دینوں کی خاطر مُوا۔ خدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے۔ باوجود خدا کے دشمن ہونے کے خدا سے اس کے بیٹے کی موت کے وسیلے سے ہمارا میل ہو گیا" (رومیوں ۵ باب)

"خدا نے مسیح کے وسیلے سے اپنے ساتھ ہمارا میل ملاپ کر لیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خدا نے مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کر لیا" (۲ کر ۵: ۱۸)

"باپ کو یہ پسند آیا کہ مسیح کے خون کے سبب صلح کر کے سب چیزوں کا اسی کے وسیلے سے اپنے ساتھ میل کرے خواہ وہ زمین کی ہوں خواہ آسمان کی" (کلسی ۱: ۱۹)

بذاتِ خود ہم انسان اس لائق نہیں کہ اپنی طرف سے کچھ خیال بھی کر سکیں بلکہ ہماری لیاقت خدا کی طرف سے ہے"۔ (۲ کر ۳: ۵)

نجات انسان کے اعمال کے سبب نہیں بلکہ ایمان کے وسیلے خدا کے فضل سے ملی ہے اور یہ انسان کی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی بخشش ہے"۔ (افسی ۲: ۸) ہے

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

انسان کی نجات اس کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ نہیں بلکہ خدا کی بخشش ہے۔ خدا غیر ارادی غیر مشخص اور ساکن ہستی کا عین نقیض ہے پس جس تصورِ خدا پر شہر اور اس کے مختلف راستوں کی مثال قائم کی گئی ہے وہ تصور بالکل باطل اور حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ انسان مختلف راستوں سے چل کر خدا کے پاس نہیں پہنچتا بلکہ :۔

"خدا نے قدیم زمانے سے حصہ بہ حصہ اور طرح بہ طرح نبیوں کی معرفت

کلام کر کے آخر کار ہم سے بیٹے کی معرفت کلام کیا ہے" (عبر ۱/۱)

خدا ساکن ہونے کی بجائے خود انسان کی خاطر مجسّم ہو کر دنیا میں آیا اور یوں اس کی لازوال محبت نے انسان کو بچانے کی خاطر پیش قدمی کی مسیحیت دیگر مذاہب کی طرح ایسا مذہب نہیں جس کو کسی ایک انسان نے یا انسانوں کے گروہ نے مسیح کے زیر اثر دریافت یا ایجاد یا وضع کیا ہو بلکہ وہ خدا کی جانب سے ایک مکاشفہ ہے جس کا مرکز مسیح ہے۔ مسیحیت کوئی ساکن نصب العین نہیں جس کو انسان نے غیر عمل طور پر گویا تاریکی میں ٹٹولتے ٹٹولتے اپنی کوششوں سے حاصل کر لیا ہو بلکہ خدا نے خود اس میں اپنی ذات کو ہم پر ظاہر کیا ہے۔ بالفاظ رپورٹ جلسۂ یروشلم :-

"مسیح کی خوشخبری ہماری دریافت کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ انسانی کوششوں سے حاصل کی گئی ہے۔ اس کے برعکس وہ خدا کا فعل ہے"۔

مسیحی ایمان یہ ہے کہ :-

"اس خدائے قادر نے ہمارے لئے بڑے بڑے کام کئے" (لوقا ۱/۴۹)

جو انسانی ارادہ پر موقوف نہیں۔ مسیحی اُس بات پر ایمان لاتے ہیں

"جو نہ خون سے نہ جسم کی خواہش سے اور نہ انسان کے ارادہ سے پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کا منبع اور سرچشمہ خود خدا کی ذات ہے" (یوحنا ۱/۱۳)

خدا باپ نے اپنی ازلی محبت کی وجہ سے اپنے فرزندوں کو بچانے کے لئے اپنا ہاتھ پھیلایا ہے تاکہ ان کو اپنے لامحدود فضل سے نجات دے۔ الٰہی محبت نے انسان کو بچانے کی خاطر پیش قدمی کی۔ پس خدا کے پاس پہنچنے کے راستے مختلف نہیں بلکہ راہ ایک ہی ہے اور وہ محبت کی راہ

ہے جو صراطِ مستقیم ہے۔ چنانچہ خداوند مسیح نے خود فرمایا ہے کہ

"راہ۔ حق اور زندگی میں ہوں۔ کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا"۔ (یوحنا ۱۴: ۶)

(۳۳)

جو اصحاب یہ خیال کرتے ہیں کہ مذاہب انسانی کوشش کا نتیجہ ہیں وہ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ "مذہب" اور "کلچر" یا ثقافت میں تمیز نہیں کر سکتے۔ وہ مذہب کو ایک قسم کی کلچر خیال کرتے ہیں جس کو ترقی دینا انسان کا فرض ہے چنانچہ اخبار انڈین سوشل ریفارمر بمبئی کا ایڈیٹر رقمطراز ہے کہ :-

"بدھ اور کرشن جیسے عظیم الشان اُستادوں کی تعلیم کو ہمیں قطعی سمجھ کر قبول نہیں کرنا چاہئے اس کے برعکس ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی تعلیم کو ایک قدم آگے لے جائیں تاکہ انسانی نوع کی اخلاقی اور روحانی ترقی ہو"

(مورخہ ۲ فروری ۱۹۴۱ء)

لیکن مذہب کلچر نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی جانب سے مکاشفہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاکھوں سال کی تلاش کے باوجود انسان اپنی مساعیٔ جمیلہ سے خدا کا وہ علم حاصل نہ کر سکا جو ہم کو خداوند یسوع مسیح کے ذریعے ملا ہے۔ انسانی فطرت ہم کو وہ معرفتِ الٰہی نہیں بخش سکی جو فوق الفطرت طاقت نے عطا کی ہے یہی وجہ ہے کہ جو مکاشفہ ہم کو مسیح یسوع کے ذریعہ ملا ہے وہ لاثانی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دیگر مذاہب میں اور اس مکاشفہ میں صرف درجہ کا فرق نہیں بلکہ نوعیت کا فرق ہے۔ دیگر مذاہب مسیحیت کی قسم کے مذہب نہیں ہیں۔ مسیحیت بے نظیر اور بے عدیل

ہے کیونکہ وہ خُدا کی جانب سے مکاشفہ کی صورت میں ملی ہے ۔ دیگر مذاہب ہم کو صرف اُس وقت تک بھلے معلوم ہوتے ہیں جب تک کہ اُن کو انجیل جلیل کی روشنی میں نہ لایا جائے لیکن جونہی ہم ان کو کلمتہ اللہ کے جلال کی روشنی میں دیکھتے ہیں ہم کو انسانی کوششوں اور الٰہی مکاشفہ میں فرق فوراً معلوم ہو جاتا ہے اور ہم کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ان مذاہب میں درحقیقت کوئی مکاشفہ نہیں ہے بلکہ مسیحیت ہی خُدا کی طرف سے ایک کامل اور اکمل مکاشفہ ہے ۔

ؔ وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صُبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا

(۴)

پس مسٹر گاندھی کا یہ خیال کہ انسان خُود اپنی کوششوں سے خُدا کو حاصل کر سکتا ہے غلط ہے اور انجیل جلیل کے خلاف ہے ۔ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں :-

"جو بات میں حاصل کرنا چاہتا ہوں اور جس بات کی تحصیل میں گذشتہ تیس سالوں سے میں کوشاں رہا ہوں وہ اپنے نفس اور ذات کی پہچان ہے یعنی میں خُدا کو روبرو دیکھنا چاہتا ہوں اور یہی کاوش ہے۔"

لیکن باوجود اپنی تیس سالہ پے در پے مخلصانہ کوششوں کے آپ کو آخر الامر اقرار کرنا پڑا "میں نے خُدا کو حاصل نہیں کیا لیکن میں اس کی تلاش میں ہوں ۔ میں اس کو نہیں جانتا۔" جب مہاتماؤں کا یہ حال ہے تو ما و شما کس شمار و قطار میں ہیں ۔ ہر اُس شخص کا یہی تجربہ ہے جو صرف اپنی مساعیٔ جمیلہ کے ذریعہ خُدا کو تلاش کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے برعکس ہر مسیحی کو خُدا کا ذاتی تجربہ حاصل ہے کیونکہ وہ "اُس آسمانی بخشش کا مزہ چکھ چکے ہیں" (عبر ۶: ۴) جس سے گاندھی جی جیسے مہاتما پُرش ناواقف

اور بے خبر ہیں ۔ سچ ہے :-

"جو آسمان کی بادشاہت میں چھوٹا ہے وہ اس (گاندھی جی) سے بڑا ہے۔"

(متی ۱۱: ۱۱)

گاندھی جی کا بُنیادی نظریہ غلط ہے کہ خُدا ایک غیر متشخص ہستی ہے جس کو وہ کبھی خُدا اور کبھی ست اور حق کہتے ہیں اور اسی بُنیادی اور اصُولی غلطی کی وجہ سے مہاتما جی راہِ حق سے کوسوں دُور جا پڑے ہیں۔

(۵)

تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ جب مسیحی مبلغین گذشتہ صدی میں ہمارے ملک ہندوستان میں وارد ہوئے تو ہندوستان کی حالت بعینہٖ رُومی یُونانی دُنیا کی سی حالت تھی جس کا ذکر ہم اپنے رسالہ نُور الہدیٰ میں کر چکے ہیں ۔ مقدس پولوس اُس زمانہ کی حالت کا نقشہ دیکھ کر فرماتے ہیں :

"جب وقت پُورا ہو گیا تو خُدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا تاکہ ہم کو لے پالک ہونے کا درجہ ملے" (گلتی ۴/۴)

رسُول مقبُول کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اُس زمانہ میں دُنیا اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ اب وہ اس قابل ہو گئی تھی کہ ایک نیا قدم آگے بڑھا سکے ۔ جس شخص نے ہماری کتاب نُور الہدیٰ کو پڑھا ہے اس پر یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ اُس زمانہ کی دُنیا تاریکی اور بُت پرستی اور اوہام پرستی وغیرہ میں پڑی کراہ رہی تھی پس رسُول مقبُول کا اِن الفاظ سے یہ مطلب تھا کہ دُنیا کی روحانی حالت کا دیوالہ نکل گیا تھا اور اس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ صرف اللہ کی ذات ہی اس کو بچا سکتی تھی ۔ پس خُدا نے اپنی لازوال محبّت کی وجہ سے پیش قدمی کر کے دُنیا کو بچایا ۔ اسی طرح اب خُدا

ہندوستان کو بچانا چاہتا ہے۔ اور یہ محض اس کے فضل و کرم کی وجہ سے ہے۔ مسیحیت ہندومت کا یہ نظریہ قبول نہیں کرسکتی کہ انسانی فطرت میں کاملیت نہاں اور پوشیدہ ہے جو خاطر خواہ ماحول میں نمودار ہوجاتی ہے بلکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ انسان کے دل و دماغ ترقی نہیں کرسکتے تاوقتیکہ ان میں مافوق الفطرت زندگی سرایت نہ کرے۔ اور یہ زندگی صرف خداوند مسیح ہے کیونکہ صرف اسی میں "زندگی ہے اور یہ زندگی انسانوں کو منور کر دیتی ہے" (یو ۱/۴) +

ہندو مذہب کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی کالبد میں الوہیت موجود ہے۔ اور یہ الوہیت انسانی فطرت کی وجہ سے انسان میں موجود ہے لیکن مسیحیت اس قسم کے خیالات کی قائل نہیں ہوسکتی۔ اس نظریہ کے برعکس اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کا روحانی کمال اس بات پر منحصر ہے کہ وہ خدا کا فرزند ہو۔ انسان کو فطرتاً خدا کے فرزند ہونے کا حق حاصل نہیں پس وہ اپنی فطرت اور سرشت کی وجہ سے اوجِ کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جو منجی عالمین کو اپنا نجات دہندہ قبول کرتے ہیں:۔

"خدا ان کو اپنے فرزند بننے کا حق بخشتا ہے یعنی اُن کو جو اس کے نام پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ نہ سرشتِ انسانی کی وجہ سے اور نہ جسمانی اقتضاء کی وجہ سے اور نہ انسانی ارادہ کی وجہ سے بلکہ خدا کے فضل کی وجہ سے کمالیت حاصل کرتے ہیں" (یوحنا ۱/۱۳)

صرف خدا کی روح کے وسیلے انسان از سرِ نو پیدا ہوسکتا ہے اور جب تک وہ نیا مخلوق نہ بن جائے وہ خدا کی بادشاہی میں داخل نہیں ہو سکتا (یوحنا ۳ باب)

پس مسیحیت کا مکاشفہ خدا کے فضل اور کرم کا نتیجہ ہے وہ انسانی کدوکاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ الٰہی تلاش کا نتیجہ ہے جو خدا گنہگار انسان کی خاطر اپنی ازلی اور ابدی محبت کی وجہ سے کرتا ہے +

کیا خدا مجرد تصور ہے

مسٹر گاندھی کا نظریہ جو وہ خدا کی نسبت رکھتے ہیں سر سے سے غلط ہے۔ آپ نے ایک مشنری سے اثنائے ملاقات میں کہا:۔

"مَیں یہ نہیں مانتا کہ خدا کوئی شخصیت رکھتا ہے۔ میرے لئے حق کا مجرد تصور خدا ہے۔ خدا محض ایک تصور ہے" (ہریجن ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء صفحہ ۵۵)

لفظ "خدا" مہاتما جی کی زبان پر بہت جاری رہتا ہے لیکن آپ کے نزدیک خدا اور حق دونوں ایک ہیں اور وہ محض مجرد تصور ہیں۔ خدا کی پروردگاری کا جو تصور وہ رکھتے ہیں وہ بھی اسی قسم کا ہے۔ ان کے خیالات کی تہ میں اُپنشدوں کا نظریہ ہے جو یہ مانتا ہے کہ برہما ایک غیر متشخص طاقت یا جوہر ہے جو کائنات میں ساری اور طاری ہے۔ ویدانت کے اصول کے مطابق وجودِ مطلق ایک ایسی غیر متشخص ہستی ہے جو اخلاقی صفات سے متصف نہیں ہے لیکن مسیحیت کے مطابق خدا ایک ایسی ہستی ہے جس کی ذات محبت ہے اور یہ ہستی اخلاقیات کا سرچشمہ ہے۔ کیا اس سے زیادہ بدیہی فرق ممکن ہے؟ پھر ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں متضاد نظریے یکساں طور پر صحیح اور درست ہیں اور فرق صرف نام کا ہے؟ دونوں نظریوں کو یکساں طور پر صحیح قرار دینا محالِ عقلی ہے +

بالآخر طوعاً و کرہاً مسٹر گاندھی کو تسلیم کرنا ہی پڑا کہ "اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف مذاہب میں لفظ "خدا" کے تصور الگ الگ

ہیں لیکن پھر کیا ہوا؟" گویا آپ کی منطق میں اجتماع الضدین کوئی بات ہی نہیں! ع

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

اس نظریہ کا نتیجہ

چونکہ مسٹر گاندھی کا تصورِ خدا کا نظریہ غلط ہے لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو نظریہ آپ بنی آدم کے متعلق رکھتے ہیں وہ تصور بھی غلط ہو۔ جب خدا شخصیت نہیں رکھتا تو وہ نوعِ انسانی کا باپ کس طرح ہو سکتا ہے اور بنی آدم ایک دوسرے کے ساتھ اُخوّت و مساوات کا سلوک کس طرح کر سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ مسٹر گاندھی کے پاس انسانی فطرت کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں اور وہ اپنے مقلدین کو اپنے بدقسمت بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے پر اُبھار نہیں سکتے۔ انجیل جلیل میں خداوند مسیح نے صاف فرمایا ہے کہ:-

"جو نیک سلوک تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ کیا وہ خدا کے ساتھ کیا" اور جو سلوک تم نے ان سب سے چھوٹوں میں سے کسی ایک کے ساتھ نہ کیا وہ تم نے خدا کے ساتھ نہ کیا"۔ (متی ۲۵ باب)

لیکن چونکہ مسٹر گاندھی کے مذہب کی تعلیم میں اس قسم کے محرکات کے لئے جگہ نہیں وہ نہیں جانتے کہ کیا کریں۔ اس کا اصلی باعث یہ ہے کہ تصورِ الٰہی کے نظریہ کا اثر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تعلقات پر طبعاً پڑتا ہے۔ پس قدرتی طور پر ہندو مت کے پیرو انسانی تعلقات کو اُس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ سکتے جس نظر سے مسیحی دیکھتے

ہیں۔ پس ہندو مت کا لازمی نتیجہ ذات پات کی تمیز اور اچھوت اقوام کا وجود وغیرہ ہے لیکن مسیحیت کا لازمی نتیجہ اُخوّت و مساوات ہے۔ ہندو دھرم اپنے اصولوں پر قائم رہ کر ان اصلاحی کوششوں میں جو اُس کے معاونین سر توڑ کر رہے ہیں حصّہ نہیں لے سکتا چنانچہ اکھیل بھارت سناتن دھرم و دوات پری شاد نے اپنے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۶ء میں اچھوتوں کے کنوؤں سے پانی بھرنے۔ مندروں میں داخل ہونے۔ ذات پات اور شُدھی وغیرہ کے مسائل پر پانچ دن متواتر بحث اور غور و فکر کر کے یہ قرار دیا کہ ان امور میں دخل اندازی کرنا ہندو مت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ آل انڈیا سناتن دھرم کانفرنس نے ۱۹۳۷ء میں اچھوتوں کے مندروں میں داخلہ کی نسبت یہ فیصلہ صادر کیا کہ ہندو شاستروں کی رُو سے وہ مندروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ان کا متفقہ فتوےٰ یہ تھا کہ یہ باتیں ہندو اصول کے مطابق جائز ہیں اور ان میں دست اندازی کرنا ہندو مت کے اصول کے ساتھ کھیلنا ہے! ان کانفرنسوں کے اجلاس کے متعلق لبرل ہندو وازم کے اخبار "بھارت دھرم" کا ایڈیٹر رقمطراز ہے کہ:-

"ہمارا یہ گمان تھا کہ ممکن ہے کہ موجودہ حالات کو مدِ نظر رکھ کر ہمارے پنڈت صاحبان کسی اور نتیجہ پر پہنچ جائیں۔ اُن کو کم ازکم اس بات کا خیال کرنا چاہئے تھا کہ ہزاروں لوگ اپنی رُوحانی بھوک کی وجہ سے ہمارے مذہب کو ترک کر کے دیگر مذاہب میں داخل ہو رہے ہیں لیکن غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔ ہمارے پنڈت صاحبان شاستروں کے مُردہ الفاظ کو اور دقیانوسی آیات کو نہیں چھوڑتے اور نہ وہ موجودہ نسل کی روش

پر غور کرتے ہیں۔ وہ ہم کو یہ خیال کرنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ جس فضا میں یہ مذہب پھلتا پھولتا ہے۔ اس میں ہم سانس نہیں لے سکتے۔ اور اُن کے مذہب میں دورِ حاضرہ کے لئے کوئی پیغام نہیں"۔

Quoted in the Guardian, March 3, 1938

حق تو یہ ہے کہ ہندو مت اپنے پیرووں پر افیون کا سا اثر رکھتا ہے۔ اُس نے ہمارے ہموطنوں کو خوابِ غفلت میں ایسا سُلا دیا ہے کہ اُن کو بیدار کرنا جان جوکھوں کا کام ہو گیا ہے۔ ہمارے ہم وطن اس خوابِ گراں میں ہندو دھرم کے اصول کی وجہ سے پڑ گئے ہیں۔ چنانچہ مسٹر گاندھی دھرم کی تعریف یُوں کرتے ہیں:-

"دھرم میں وہ تمام گرد و پیش کے حالات شامل ہوتے ہیں جن کے درمیان خُدا نے ہم کو رکھا ہے۔ دھرم کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص ان حالات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے اور اپنی بہتری فلاح اور بہبودی کی خاطر ان حالات کے خلاف بغاوت نہ کرے اور نہ ان حدود سے تجاوز کرے"۔

دھرم کی یہ تعریف مسٹر گاندھی کی اپنی نہیں بلکہ ہندو کُتب مقدسہ کی ہے چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن جی کہتے ہیں:-

"اپنا دھرم (دستور العمل) ہو دوسروں کے پورے اور کامل دھرم سے بہتر ہے خواہ وہ قابل تعریف بھی نہ ہو" (۳/۳۵) "اے ارجن۔ تو اپنے دھرم کی طرف طرف نگاہ کر کیونکہ کشتری کو جنگ کرنے سے ہی نجات حاصل ہوتی ہے اور چھتری کے دھرم کو پورا کرنے سے انکار کرنا تیرے لیے گناہ

Andrews, M. Gandhi's Ideas, p. 129

ہے (۲/۳۳)۔ "چھتری شودر ویش برہمن کے اپنے اپنے گُن اور افعال ہیں۔ برہمن کے کرم شم۔ دم۔ تپ اور علم صفائی وغیرہ ہیں چھتری کا کام شجاعت سے جنگ وجدل کرنا ہے۔ ویش تجارت کھیتی باڑی کا کام کرے اور شودر کا کام خدمت اور تواضع کرنا ہے۔ ہر ایک انسان اپنے اپنے دھرم کے کرنے سے درجہ پاتا ہے۔ اوروں کے کامل دھرم سے اپنا خام دھرم بہتر ہے اگر ہم اپنی اپنی ذات کا کرم کریں تو کوئی گناہ نہیں ہے اگر اپنا کرم بُرا بھی ہو تو بھی اس کو ترک کرنا نہایت بُرا کام ہے" (۱۸/۴۱-۴۸)

اگر دھرم کی یہ تعریف درست ہے تو یقیناً ہندو دھرم اس قابل نہیں کہ کوئی شخص اُس کا حلقہ بگوش رہے۔ کیونکہ جب دھرم پر ایمان رکھنے کا یہ نتیجہ ہو کہ انسان اپنے حالاتِ گرد و پیش سے بغاوت نہ کرے اور اپنی فلاح کو مدِ نظر رکھ کر اپنی سطح سے اوپر نہ اُٹھے وہ کس طرح ترقی کر سکتا ہے؟ اندریں حالات ہندی قوم اور بنی نوع انسان کی ترقی کی کیا اُمید ہو سکتی ہے؟

رام کرشن پرم ہمس کا مذہب

دورِ حاضرہ میں سری رام کرشن پرم ہمس اور آپ کے شاگرد سوامی ویویکانند نے ان خیالات کو مروّج کرنے کی ازحد کوشش کی ہے کہ تمام مذاہب یکساں ہیں اور یکساں طور پر خُدا کی قربت عطا کرتے ہیں۔ ان دونوں مہاتما پُرشوں کی اعلےٰ زندگیوں نے ہندوستان کی نوجوان پُشت کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ پس متعدد ہندو نوجوان اُن کی زندگیوں سے متاثر ہو کر ان کی تعلیم کو برحق سمجھنے لگ گئے ہیں۔ رام کرشن خود کالی دیوی کی پوجا کیا کرتے تھے۔ آپ اس کی مورت کے سامنے گھنٹوں بیٹھا

کرتے تا وقتیکہ وجد کی حالت میں نہ آجاتے۔ آپ وشنو کی پوجا بھی کرتے تھے اور رادھا کا لباس پہن کر آپ کرشن کی پوجا کیا کرتے تھے تاکہ آپ میں پریم کا وہی جذبہ پیدا ہو جائے جو رادھا کے دل میں تھا۔ خداوند یشوع کی محبت بھی آپ کے دل میں تھی چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ کسی ہندو دوست کے گھر میں بیٹھے تھے دیوار پر بی بی مریم اور بچے کی تصویر آویزاں تھی۔ آپ کی نظر میں یہ تصویر زندہ ہو گئی اور کئی دنوں تک آپ بی بی مریم اور خداوند مسیح کے خیال میں مست اور اُن کی محبت میں محو رہے۔ ایک روز عالمِ بے خودی میں آپ نے ایک متین چہرے اور خوبصورت آنکھوں والے انسان کو اپنی طرف آتے دیکھا اور ایک آواز سنی جو کہتی تھی کہ "مسیح کو دیکھ جس نے دُنیا کی خاطر اپنی جان دے دی ہے۔ یہ وہی ہے جو دُنیا کا سب سے بڑا یوگی ہے جو خدا کے ساتھ ایک ہے۔ یہ مسیح ہے جو محبت کا اوتار ہے"۔ پھر ابن آدم نے ابن کالی رام کرشن سے معانقہ کیا اور اس کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ رام کرشن وجد میں آگئے اور برہما کے ساتھ ایک ہو گئے اور بڑی مدت کے بعد ہوش میں آئے اور اس تجربہ کی وجہ سے الوہیتِ مسیح کے قائل ہو گئے۔

رام کرشن نہ صرف اپنے دیوتا کرشن سے ہی دُعا کرتے تھے بلکہ خداوند مسیح اور حضرت محمد سے بھی پرارتھنا کیا کرتے تھے۔ اپنے آخری ایام میں آپ نے فرمایا کہ "میں اب اُس منزل کو پہنچ گیا ہوں جہاں سے میں یہ دیکھ سکتا ہوں کہ دُنیا کا ہر فرد بشر خدا کا مظہر ہے اور کہ جس طرح خدا اپنے آپ کو ایک مقدس ہستی میں ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اس کا ایک گنہگار ہستی میں بھی ظہور ہے۔ پس جب میں کسی شخص سے ملاقات

کرتا ہوں میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ فلاں شخص خدا ہے جو ایک مقدس ہستی کی شکل میں ہے۔ فلاں شخص خدا ہے جس کا ظہور ایک گنہگار کی صورت میں ہوا ہے"۔

یہ صحیح اور منطقی نتیجہ ہے تمام مذاہب کو یکساں ماننے کا۔ اس منزل پر نیکی اور بدی۔ راستی اور ناراستی۔ جھوٹ اور سچ۔ محبت اور عداوت پاکیزگی اور پلیدگی بے معنی الفاظ ہو جاتے ہیں۔ اگر خدا کا ظہور تقدس اور ناپاکی دونوں میں ہے تو ان الفاظ کے کوئی حقیقی معنی نہیں رہتے اور نہ ان میں قطعی طور پر تمیز ہو سکتی ہے اور نہ ایسا خدا ہماری پرستش کے قابل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ رام کرشن کہتے ہیں:-

"خدا چور کو کہتا ہے جا چوری کر اور گھر کے مالک کو کہتا ہے خبردار۔"

Mozamdar, Parmahansa Rama Krishna, p. 103

آپ کے شاگرد رشید سوامی ویویکانند کہتے ہیں کہ:-

"گناہ محض ایک دھوکا طلسم اور مایا ہے جس کی درحقیقت کوئی ہستی نہیں۔ کسی انسان کو گنہگار کہنا سب سے بڑا گناہ ہے۔"[1]

ایسا عقیدہ اخلاق کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے لیکن جب ہم یہ مان لیں کہ خدا غیر مشخص ہے تو تمام اخلاقی امتیازات رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ نیکی۔ پاکیزگی۔ راستی۔ حق اور محبت ازلی اور اٹل حقیقتیں اور اصول ہیں لہٰذا کوئی ایسا نظریہ قبول نہیں کیا جا سکتا جس کا نتیجہ ان اخلاقی اصولوں کے خلاف ہو۔ پس ہم یہ نہیں مان سکتے کہ تمام مذاہب یکساں طور پر برحق ہیں۔

1. World's Parliament of Religions, II. p. 97

گاندھی جی کا مذہب

چونکہ گاندھی جی کی شخصیت ہمارے وطن میں نہایت بارسوخ اور پُراثر ہے لہذا ہم ان کے خیالات کو شرح اور بسط کے ساتھ ناظرین کے روبرو پیش کرتے ہیں۔ ذیل کے اقتباسات ان کی تحریرات سے لئے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :-

"میرا یہ دعوے ہے کہ میں ایک ایماندار شخص اور مردِ دعا ہوں اور اگر میرے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیئے جائیں مجھے یقین ہے کہ خدا مجھے طاقت بخشے گا کہ میں اس کا انکار نہ کروں بلکہ اس کی ہستی کا اقرار کروں۔ مسلمان کہتے ہیں لاآلہ الا اللہ۔ مسیحی بھی یہی کہتے ہیں اور ہندو بھی یہی مانتے ہیں۔ بُدھ مت کے پیرو دوسرے الفاظ میں یہی اقرار کرتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف ادیان میں لفظ "خدا" کے تصورات جُدا جُدا ہیں اور گو ہم ایک ہی لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ تاہم مختلف لوگوں کے لئے اس لفظ کا مفہوم مختلف ہے۔ لیکن پھر کیا ہُوا؟ ہم جو خدا کے سامنے رینگنے والی مخلوق ہیں اس کی لامحدود عظمت محبت اور رحم کو کس طرح جان سکتے ہیں ..... یہ لازم نہیں ہے کہ ہم اپنی تقریروں اور تحریروں سے دوسرے لوگوں کو اپنے دین میں داخل کریں ... اگر میرے مشنری دوست اس بات کو قبول کریں تو مذہبی معاملات میں بُغض۔ حسد۔ رقابت۔ شکوک اور تفرقوں کی گنجائش ہی نہ رہے گی بلکہ ہر جگہ صُلح اور امن کا دَورہ ہوگا ... مشنریل کا یہ کام نہیں کہ مشرقی لوگوں کی زندگیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں ... وہ ہم کو ہماری حالت پر چھوڑ دیں" ....

مَیں نے بائبل کو مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے اور مَیں اس کو

اپنی عبادتی کُتب کا ایک حصّہ سمجھتا ہوں پہاڑی وعظ کی رُوح نے میرے دل کو قریب قریب اُسی طرح موہ لیا ہے جس طرح بھاگوت گیتا نے۔ مَیں یہ دعوے کرتا ہوں کہ مَیں کسی مسیحی سے پیچھے نہیں ہوں جب مَیں یہ مسیحی گیت گاتا ہوں کہ "اے مسیح کے نُور۔ تو شبِ دیجور کو روشن کر اور میری رہنمائی کر" +

"پہاڑی وعظ میں مسیح کا پیغام صاف اور خالص ہے۔ وہ بغیر کسی آمیزش کے اُس میں مکمل طور پر موجود ہے" +

"حق تو یہ ہے کہ انجیل نے ہی مجھ کو ستیاگراہ کی قدر اور وقعت سکھلائی اور بتلایا کہ یہی راہ اور طریقہ راست درست اور صحیح ہے" +

"میرے نزدیک یسُوع دُنیا کے عظیم الشان معلموں میں سے ایک ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے ہمعصروں کے لئے خدا کا اکلوتا بیٹا تھا لیکن یہ ضرور نہیں کہ مَیں اس عقیدہ کے ساتھ اتفاق کروں۔ مَیں یہ مانتا ہوں کہ خُدا کے اکلوتے بیٹے بہت ہیں لیکن اس کے باوجود یسُوع نے میری زندگی کو متاثر کر رکھا ہے۔ مَیں لفظ "اکلوتے" کو اُس کے لفظی معنوں میں استعمال نہیں کرتا۔ میرے خیال میں اس لفظ کا مطلب زیادہ گہرا ہے کیونکہ اس لفظ سے میری مراد "روحانی پیدائش" ہے۔ یسُوع مسیح اپنے زمانے کے لوگوں میں سب سے زیادہ خدا کے قریب تھے۔ آپ نے اُن لوگوں کے گناہوں کی خاطر جو آپ کی تعلیم کو مانتے تھے اپنے کامل نمونہ سے فدیہ دیا لیکن آپ کا کامل نمونہ اُن لوگوں کے لئے کسی کام کا نہ تھا جو اپنی زندگیوں کو تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جس طرح صاف کیا ہُوا سونا اپنی میل کو چھوڑ دیتا ہے اسی طرح جو شخص نئے سرے سے پیدا ہوتا

(چرچ آف انگلینڈ تو نیپیر ا مارچ ۱۹۳۹ء)

ہے اپنی بُرائی کو ترک کر دیتا ہے"

"میں مسیحیت میں بہت سی باتوں کا مداح ہوں لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس صورت میں ہندو مذہب کا میں قائل ہوں اُس سے میری رُوح کو پُوری تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اُپنشدوں اور بھاگوت گیتا سے مجھ کو وہ تسلی ملتی ہے جو پہاڑی وعظ سے بھی نہیں ملتی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پہاڑی وعظ کے نصب العین نے میرے دل میں جگہ کر لی ہے لیکن نا امیدی، یاس، شک اور رُوحانی تاریکی کے ایام میں بھاگوت گیتا سے ہی مجھے شانتی ملتی ہے۔ جب میں اس کی ایک آیت پڑھتا ہوں تو غم کے بادل دور ہو جاتے ہیں۔ میری زندگی الم ناک داستانوں سے پُر ہے لیکن بھاگوت گیتا کی تعلیم کی وجہ سے غم اور رنج کا اثر مجھ پر نہیں ہوتا...... میں نے بائبل کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے قرآن کو دیکھا ہے اور یہودیت کو سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ میں نے زرتشت کے مذہب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور میں بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمام مذاہب حق پر ہیں اور ان میں سے ہر ایک مذہب غیر مکمل ہے" ❖

"میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ (۱) میرا ایمان ویدوں، اُپنشدوں، پرانوں اور دیگر تمام ہندو کتابوں پر ہے۔ میں اوتاروں کا قائل ہوں اور آواگون کو مانتا ہوں۔ (۲) میں ورن آشرم دھرم (ذات پات) کا قائل ہوں اور میرا ایمان ہے کہ یہ ویدوں کی تعلیم ہے۔ (۳) میں گئو رکھشا کا قائل ہوں اور (۴) میں بُت پرستی کو ماننے کے خلاف نہیں ہوں" ❖

"جب میں بزعم خود بستر مرگ پر تھا تو گیتا ہی میری تسلی کا موجب تھی"۔

"ہندو مذہب میں تمام دُنیا کے انبیا کی پرستش کے لئے جگہ ہے"۔

"اگر مجھے قرآن اور بائبل کی تاویل کرنے کی اجازت ہو تو میں ان کو اپنی تاویل کے مطابق مان کر اپنے آپ کو مسلمان یا مسیحی کہہ سکتا ہوں۔ کیونکہ میرے لئے الفاظ "ہندو" "مسلمان" اور "مسیحی" مترادف الفاظ ہونگے۔

اے دلؔ اس بے وفا کی مہربانی پر نہ بھول ‏ ‏ ‏ دل کا دشمن ہے اگر کرتا ہے باتیں پیار کی

مسیحیت کی نسبت گاندھی جی کہتے ہیں :-

میرے لئے اس بات پر ایمان لانا ناممکن ہے کہ میں صرف مسیحی ہو کر ہی نجات حاصل کر سکتا ہوں میں یہ نہیں مان سکتا کہ یسوع ہی اکیلا مجسم اوتار اور ابن اللہ ہے اور صرف وہی لوگ ابدی زندگی حاصل کر سکتے ہیں جو آپ پر ایمان لاتے ہیں۔ اگر انسان کے لئے خدا کا بیٹا ہونا ممکن ہے تو کُل انسان خُدا کے بیٹے ہیں۔ اگر یسوع خدا کی مانند تھے یا خُدا تھے تو تمام انسان خدا کی مانند ہیں اور خُدا ہو سکتے ہیں۔ میری عقل اِس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ یسوع کی مَوت اور خُون سے دُنیا کے گُناہ دُور ہو سکتے ہیں۔ ہاں تمثیلی پیرایہ میں یہ بات ہو سکتی ہے۔ ...... میں یسوع کو ایک شہید کے طور پر مان سکتا ہوں۔ آپ سراسر ایثار مجسّم تھے۔ اور خُدا کی طرف سے ایک اُستاد تھے لیکن آپ کامل اور اکمل ہستی نہ تھے۔ آپ کی صلیبی مَوت دُنیا کے لئے ایک زبردست نمونہ ہے۔... یہ ناممکن ہے کہ میں مسیحیت کو تمام مذاہب سے اعلیٰ اور افضل یا ایک کامل مذہب مان لوں" ❖

"سالہا سال سے میں اس بات کو مانتا چلا آیا ہوں کہ یسوع ناصری

دُنیا کے عظیم الشان استادوں میں سے ایک اُستاد تھا۔ مَیں جانتا ہُوں کہ مسیحی آپ کو اس سے کہیں بڑا رُتبہ دیتے ہیں لیکن مَیں جو ایک غیر مسیحی ہُوں اور ہندو ہُوں آپ کو اس سے زیادہ نہیں مانتا۔ مَیں ان ہندوؤں سے جو اس کالج میں تعلیم پا رہے ہیں یہ کہتا ہُوں کہ جب تک تُم یسُوع ناصری کی تعلیم کا انکساری کے ساتھ مطالعہ نہیں کرو گے تمہاری زندگیاں غیر مکمّل رہیں گی۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ جو شخص خواہ وہ کسی مذہب کا پیرو ہو۔ دیگر مذاہب کا مطالعہ انکساری کے ساتھ کرتا ہے وہ اپنے ذہن کو وسیع کرتا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ دُنیا کے بڑے مذاہب میں سے کوئی مذہب بھی باطل نہیں ہے۔ تمام مذاہب نے بنی نوع انسان کو بہتر بنا دیا ہے اور اب بھی وہ اپنا مطلب پُورا کر رہے ہیں۔ . . . ہر شخص کا مذہب اس کے اور اس کے خالق کے باہمی تعلق کا نام ہے . . . بعض خُدا کو رام بلاتے ہیں۔ بعض اس کو کرشن کے نام سے پکارتے ہیں اور بعض اس کو اللہ کہتے ہیں۔ تمام انسان ایک ہی رُوح کی پرستش کرتے ہیں" +

"یسوع کا مکاشفہ ایک روشن مکاشفہ ہے لیکن وہ بے عدیل مکاشفہ نہیں ہے۔ یسُوع مسیح اکیلا تخت نشین اور واحد تاجدار نہیں کیونکہ میرا یہ ایمان ہے کہ خُدا بار بار مجسّم ہُوا ہے" +

مرحوم مسٹر اینڈروز لکھتے ہیں کہ:-

جب کبھی میں سبرمتی آشرم میں جاتا تھا تو گاندھی جی کا یہ قاعدہ تھا کہ عبادت کے اختتام سے پہلے مجھ سے مسیحی گیت گانے کی فرمائش کیا کرتے ان گیتوں کے مطلع جن کو وہ پسند کرتے تھے حسب ذیل ہیں:-

(۱) "الٰہی نُور کر روشن یہ دیجور۔ تو رہبر ہو"۔

(۲) "صلیب پر جب میں کرتا دھیان۔ جس پر مُوا شاہِ ذوالجلال"۔

(۳) "تجھ پاس خُداوندا۔ تجھ پاس خُدا"۔

(۴) "یسُوع تُو ہے میری آس۔ آتا ہوں مَیں تیرے پاس"۔

(۵) "رہ میرے ساتھ۔ جلد ہُوا چاہتی ہے شام"۔

"مَیں اس بات کا قائل نہیں کہ ویدوں کے علاوہ کوئی اور کتاب الہامی نہیں ہے۔ مَیں بائبل۔ قرآن۔ ژند اوستا کو ویدوں کے برابر الہامی مانتا ہوں۔ میں اس بات کو ضروری نہیں سمجھتا کہ ہندوؤں کی مقدّس کتابوں کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت کو الہامی مانا جائے۔ مَیں ان کتابوں کی کوئی ایسی تفسیر ماننے کو تیار نہیں ہوں جو عقل اور اخلاق کے خلاف ہو خواہ وہ مفسّر کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو" [1]

مسٹر گاندھی کے خیالات کی مفصّل تنقیح و تنقید ہم انشاء اللہ اس رسالہ کے آیندہ ابواب میں کرینگے۔ یہاں ہم کو صرف یہ دکھلانا کہ مسٹر گاندھی تمام مذاہب کو یکساں طور پر صحیح مانتے ہیں اور یہاں ہم اس نظریہ کے حسن و قبح پر بحث کرنے پہ اکتفا کرینگے +

(۱)

یہ بات حق ہے کہ مختلف مذاہب میں صداقت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ہم اپنے رسالہ "مسیحیت کی عالمگیری" کے باب دوم میں یہ ثابت کر آئے ہیں کہ ہر ایک مذہب میں صداقت کی جھلک پائی جاتی ہے

1. Andrews, M. Gandhi's Ideas, p. 73, 74

اور کوئی مذہب ایسا نہیں جو الف سے لے کر ی تک باطل اور شیطانی ہو۔ انجیل جلیل اور مسیحی کلیسیا کی یہ تعلیم ہے کہ:۔

"جس طرح آفتاب عالمتاب کے نور سے چاند اور ستارے چمکتے ہیں اسی طرح مسیح کلمتہ اللہ کے نور سے جو آفتاب صداقت ہے کل اقوام وممالک فیض یاب ہوتے ہیں" (یوحنا ۱:۹ وغیرہ)

لیکن جس طرح

"آفتاب کا جلال اور ہے اور ماہتاب کا جلال اور ہے اور ستاروں کا جلال اور ہے کیونکہ ستارے ستارے کے جلال میں فرق ہے"۔ (۱کر ۱۵: ۴۱)

اسی طرح مسیحیت کا جلال اور ہے اسلام کا جلال اور ہے۔ ہندو مذہب کا جلال اور ہے۔ بلکہ ہندو مذہب کے فرقوں کے جلال میں بھی فرق ہے۔ لیکن چونکہ سب مذاہب میں صداقت کے عناصر پائے جاتے ہیں اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام مذاہب یکساں طور پر برحق ہیں اور اُن میں کسی قسم کا فرق نہیں ✣

دُنیا میں کوئی اخلاقی مذہب ایسا نہیں جو کلیتہً باطل ہو اور جس میں گھٹا ٹوپ تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی ہو۔ ہر ایک مذہب میں جو اخلاقی اصُول کے خلاف نہیں کسی حد تک نورِ صداقت کی جھلک نظر آتی ہے۔ خُدا نے کسی شخص اور قوم اور ملک کو بغیر گواہ کے نہیں چھوڑا۔ ہر شخص کے دل میں کم از کم اس کے ضمیر کی روشنی موجود ہوتی ہے خواہ وہ روشنی کیسی ہی مدہم کیوں نہ ہو۔ دُنیا کے مختلف مذاہب آفتاب صداقت کی شعاعوں سے کم و بیش منور ہیں۔ اس واضح حقیقت کو آبائے کلیسیا نے یُوں ظاہر کیا ہے کہ کلمتہ اللہ جو ازل سے موجود ہے "حقیقی نُور ہے جو ہر ایک آدمی کو روشن کرتا ہے"۔ وہ ابتداء میں تھا اور ابتدا ہی سے

اس کا نُور تاریکی میں چمکتا رہا ہے اور اسی نُور کے پرتَو کی وجہ سے دُنیا کے مختلف مذاہب میں صداقت کا عنصر پایا جاتا ہے کیونکہ "اس کلمتہ اللہ کی معموری میں سے ہم سب نے پایا"۔ (یوحنا ۱:۱۴) یہ تمام مذاہب آفتاب صداقت یعنی خُداوند یسُوع مسیح کے پیش خیمہ ہیں اور "مسیح تک پہنچانے کو ہمارے اُستاد بنے" (گلتی ۳:۲۴) دُنیا کے تمام دیگر مذاہب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گنہگار انسان کی سرشت میں یہ خواہش موجود ہے کہ اس کا کسی نہ کسی طریقہ سے خُدا کے ساتھ میل ملاپ ہو جائے لیکن یہ ملاپ صرف اس محبّت کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے جو خُدا باپ اپنے بچّوں کے ساتھ رکھتا ہے اور جس کا کامل مکاشفہ انجیل جلیل میں موجود ہے۔ مسیحؑ کونین نے اپنی تعلیم۔ زندگی اور مَوت کے وسیلے اس محبّت کو کامل اور اکمل طور پر ظاہر فرمایا۔ مختلف مذاہب میں صداقت کا عنصر پایا جاتا ہے اور اس عنصر کی روشنی ان مذاہب کے پیروؤں کو ابن اللہ کے قدموں تک لانے کا کام سر انجام دیتی ہے۔ یہ صداقت کا عنصر ظاہر کرتا ہے کہ مسیحؑ عالمین کل اقوام عالم کے ادیان کا مطمح نظر اور نصب العین ہیں ✣

اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کر دیتے ہیں۔ لڑکا جب سکول جاتا ہے تو الف۔ ب اور قاعدہ پڑھتا ہے۔ اس کے بعد ابتدائی کتابیں پڑھتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ مبتدی سے منتہی بن جاتا ہے۔ اسی طرح ادیانِ عالم ابتدائی مدارج کے مذاہب ہیں اور انتہائی درجہ مسیحیت کا ہے۔ جس طرح قاعدہ میں علم کی شعاع کا پرتَو موجود ہے اسی طرح ابتدائی منازل کے مُشرکانہ مذاہب میں آفتابِ صداقت کے نُور کا پرتَو موجود

ہے جس طرح طالب علم رفتہ رفتہ ترقی کرکے علم کے ابتدائی منازل کو طے
کرتا ہے اور اُس میں علم کا نُور بڑھتا جاتا ہے اسی طرح جُوں جُوں ہم ابتدائی
مدارج کے مذاہب کو پیچھے چھوڑتے جاتے ہیں صداقت کا عنصر بڑھتا اور
ترقی پذیر ہوتا جاتا ہے حتےٰ کہ مسیحیت میں آفتابِ صداقت درخشاں ہو
کر چمکتا ہے ؛

لیکن کوئی صاحب ہوش یہ نہیں کہیگا کہ چونکہ قاعدہ اور ابتدائی مدارج
کی کتب میں بھی علم موجود ہے اور انتہائی درجہ کی کُتب میں بھی علم موجود ہے
لہذا تمام مدارج کی کتابوں میں یکساں طور پر علم پایا جاتا ہے۔ اسی طرح
کوئی صحیح العقل شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ ابتدائی مدارج کے
مذاہب میں بھی صداقت پائی جاتی ہے اور انتہائی مذہب میں بھی
صداقت پائی جاتی ہے لہذا تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح اور درست راست اور حق ہیں
ہمارا یہ دعوےٰ ہے کہ۔ صرف خُداوند مسیح کی انجیل ہی انتہائی مذہب ہے
جو عالمگیر ہے اور تمام ممالک اور اقوام وازمنہ کے افراد کے لئے برحق ہے

؎ آفتاب آمد۔ دلیلِ آفتاب
گر دلیلت باید۔ ازوے رُو متاب

ہم جو ہندوستان کے مسیحی ہیں اس خیال سے خوش ہوئے بغیر
نہیں رہ سکتے کہ خُداوند مسیح وہ "حقیقی نُور ہے جو ہر ایک آدمی کو روشن
کرتا ہے" (یوحنا ۱: ۵) اور اس نُور کی کرنیں ہم کو ہمارے وطن عزیز کے
مذاہب میں دکھائی دیتی ہیں۔ ہم کو اس خیال سے خوشی حاصل ہوتی
ہے کہ جس طرح "پرانا عہدنامہ" اہل یہود کو مسیح تک لایا اور وہ "نئے عہد"
میں داخل ہوگئے یا جس طرح فلسفہ یونانیوں کو مسیح تک لایا اور وہ

"حقیقی معرفت" سے بہرہ یاب ہوگئے اُسی طرح "حقیقی نُور" کی شعاعیں
وید اور اُپنشد وغیرہ کی شکل میں ہمارے آبا و اجداد کے سینوں میں چمکیں
اور ہم کو جو اُن کی اولاد ہیں یہ موقعہ دیتی ہیں کہ ہم بھی مسیح کے پاس جائیں۔
اور اگر ہم تعصب کی وجہ سے ہندو کتب مقدسہ کو اپنی روحانی خوراک
کے لئے کافی سمجھتے ہیں تو ویدوں اور اُپنشدوں اور گیتا کی بے عزتی
اور بے حُرمتی کرتے ہیں کیونکہ ہم اُن کی اصل غرض اور علّتِ غائی کو پورا
ہونے سے روکتے ہیں۔ وہ ابتدائی مراحل کی کتابیں ہیں اور ان کے
وجود کا اصلی مقصد انجیل کی انتہائی کُتب کی طرف لے جانا ہے جس
طرح اُردو قاعدہ کا مقصد تب ہی پُورا ہوتا ہے جب ہم ابتدائی کتابیں
پڑھنی شروع کریں اور ابتدائی کُتب کا مقصد تب پُورا ہوتا ہے جب
ہم علم کے بحر میں غوطے لگائیں اور اگر ایسا کرنے سے ہم پرہیز کریں تو ان
کی اصلی غرض اور علّتِ غائی فوت ہو جاتی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی
کتابیں انسانی کوششوں کا نتیجہ ہیں لہذا وہ صرف ایک خاص بلندی
تک ہی پرواز کر سکتی ہیں۔ ان کتابوں کی انتہائی بلندیاں مسیحیت کی
ابتدائی منازل ہیں۔ وید۔ اُپنشد اور بھاگوت گیتا ہم کو مسیح تک لاتی
ہے۔ تاکہ ہم اس کو اپنا منجی مان کر حقیقی الٰہی معرفت اور رفاقت
حاصل کر سکیں ؛

(۲)

لیکن مسٹر گاندھی اس قسم کے طریقۂ کار کے جانی دشمن ہیں۔ وہ
کہتے ہیں کہ مختلف مذاہب مختلف اقوام کی ضروریات کو مختلف طریقوں
سے پُورا کرتے ہیں پس ہمیں تحقیق مذاہب کی بحث میں نہیں اُلجھنا

مختلف الگ اور جُدا ہونے کی وجہ سے وہ بُنیادی ہیں۔ اور کوئی عقلمند شخص امتیازی اصولوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا ÷

بفرضِ محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اختلافی مسائل عارضی اور غیر ضروری اور فروعی قسم کے ہیں تو کیا اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ وہ اربابِ فکر کی توجہ کے قابل نہیں ہوتے؟ کیا کوئی صحیح العقل شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جو مسائل ہندو مت اور اسلام اور مسیحیت میں تمیز اور اور فرق کا باعث ہیں وہ ایسے ہیں جو غور و فکر کے قابل ہی نہیں اور ان پر توجہ دینا وقتِ عزیز کو رائیگاں کرنا ہے؟ اس قسم کی خرافات کا وہی مرتکب ہو سکتا ہے جو عقل اور مذہب دونوں سے ناآشنا ہے ÷

(۳)

سچ پوچھو تو اختلافات کو نظر انداز کرنے سے مذہبی رواداری کی بُنیاد نہیں پڑ سکتی۔ ہاں ظاہرداری اور ریاکاری کی بُنیاد پڑ سکتی ہے اور یہ امور حقیقی اتحاد کے حق میں سمِ قاتل کا کام دیتے ہیں۔ کیونکہ اخفا کی فضا میں مصالحت دوستی اور یگانگت نشو و نما نہیں پا سکتے۔ ہاں نفاق کو ترقی ہوگی کیونکہ اگر مختلف مذاہب کے پیرو اپنے اختلافی مسائل کا ذکر نہ کرینگے تو ان کی زبانیں اُن کے دلی جذبات کی ترجمان نہ ہونگی اور حق کو چھپانے اور راستی پر پردہ ڈالنے سے ہندی قوم کی فلاح اور بہبودی نہیں ہو سکتی۔ مسٹر گاندھی خُود فرماتے ہیں کہ:-

"عدم تشدد کا یہ مطلب نہیں کہ ہم حق کو اپنے آپ سے یا دُنیا سے چھپائیں"۔ (ہریجن ۳۔ فروری ۱۹۴۰ء)

مشترکہ عقائد کو بیان کرنے اور اختلافی مسائل کو چھپانے میں ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ فریق ثانی کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ فریقین میں درحقیقت کوئی فرق نہیں۔ اور یُوں فریق ثانی کو اُلّو بنایا جاتا ہے۔ اور وہ غریب اس خیال میں ہوتا ہے کہ تمام دُنیا اس کی ہم خیال ہے۔ لیکن ہر صحیح العقل شخص کو اس قسم کی ابلہ فریبی اور خود فریبی کی زہریلی فضا سے نکلنا چاہیئے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ اُن اصحاب کے عقائد کی جو اس سے اختلاف رائے رکھتے ہیں جانچ پڑتال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اپنے عقائد کی بھی ساتھ ہی تائید یا تردید ہو جائیگی۔ لیکن اگر اخفا کا پردہ فریقین کے خیالات میں حائل ہوگا تو منافقانہ رویہ کی ترقی ہوگی اور کوئی قوم نفاق کی بنیاد پر شاہراہِ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتی ؎ ہمدلی از ہمزبانی بہتر است (مولانا روم)

(۴)

مصنوعی رواداری کے حامی کہتے ہیں کہ دینی اُمور میں فقط اُن عقائد کا ذکر کرنا چاہیئے جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ لیکن کیا یہ بات سچ ہے کہ تمام مذاہب میں ایک ایسا عنصر ہے جو گویا ان کا ذواضعاف اقل ہے جب ہم ادیانِ عالم کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو تمام ادیان میں مشترکہ طور پر موجود ہو۔ مثلاً افریقہ کی مردُم خوار اقوام کے مذاہب یا خُود ہندوستان کے اصلی باشندوں کے مذاہب یا دیگر جاہل وحشی جنگلی اور پست اقوام کے مذاہب ہندو مت، بُدھ مت۔ کنفوشیس مت۔ شنٹو مت۔ یہودیت۔ زرتشت مت۔ اسلام اور مسیحیت وغیرہ میں کیا شراکت اور مناسبت ہے؟

ان سب میں کیا شے ہے جو ان تمام مذاہب میں موجود ہے اور جس کی موجودگی کی وجہ سے یہ تمام مذاہب یکساں طور پر حق اور راست ہو جاتے ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ جو شخص مختلف اقسام کے مذاہب سے سطحی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ ان میں سے بعض پر "مذہب" کے لفظ کا اطلاق کرنے سے بھی ہچکچائے گا۔ چہ جائیکہ وہ ان تمام مذاہب کو یکساں طور پر صحیح اور برحق تسلیم کر لے۔ چونکہ مذاہبِ عالم میں کوئی حقیقت ایسی نہیں جو تمام مذاہب میں پائی جائے پس اگر ہم ان مبلغینِ رواداری کے قضایا کو مان لیں تو ہم کو لازمی طور پر یہ ماننا پڑیگا کہ حقیقی دیندار وہ شخص ہے جو کسی شے پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے اشخاص مذہب کو ایک نہایت فرومایہ اور ہیچ شے خیال کرتے ہیں۔ پس کیا دینی علم و عمل کی کم مایگی مذاہبِ عالم کے اتحاد کی بنیاد ہو سکتی ہے؟

بفرضِ محال اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ تمام مذاہب میں ایک عنصر ہے جو ادیانِ عالم میں مشترک ہے تو اس کی مثال ایسی ہو گی جس طرح کل انسانوں کے جسم کا ڈھانچہ ایک ہی قسم کا ہوتا ہے لیکن محض ڈھانچہ کی بناء پر کوئی صحیح العقل شخص یہ نہیں کہیگا کہ دُنیا بھر کے انسان یکساں طور پر عاقل۔ مالدار وغیرہ ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ❖

(۵)

کیا یہ بات درست ہے کہ تمام بڑے مذاہب خُدا کو مانتے ہیں اور مسیحیت کی مانند خُدا کی ابوت اور انسانی اُخُوّت و مساوات کی تعلیم دیتے ہیں۔ مسٹر گاندھی مانتے ہیں کہ بدھ مذہب دُنیا کے بڑے مذاہب

میں سے ہے لیکن وہ نہ خُدا کا قائل ہے نہ مکاشفہ کا۔ اور نہ اس کی تعلیم کسی الہامی کتاب میں درج ہے۔ اسلام خُدا کو بنی نوعِ انسان کا باپ نہیں مانتا اور نہ ابوتِ الٰہی کی تعلیم قرآن میں ملتی ہے۔ قرآن تو اخوتِ انسانی کا بھی قائل نہیں۔ ہاں اُخُوّتِ اسلامی کا قائل ہے۔ اور کیا ہندومت خود کسی قسم کی اُخُوّت یا خُدا کی ابوت کو مانتا ہے؟ پس ظاہر ہے کہ ہم کسی حالت میں بھی تمام مذاہب کو یکساں طور پر صحیح اور حق نہیں مان سکتے ❖

(۶)

مسٹر گاندھی خود کہتے ہیں کہ "میں ہندو کُتبِ مقدسہ کی کوئی ایسی بات ماننے کو تیار نہیں جو عقل اور اخلاق کے منافی ہو"۔ پس ان الفاظ سے انھوں نے خود ایک قید لگا دی اور صداقت اور بطالت کا ایک معیار قائم کر دیا۔ اگر مسٹر گاندھی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس معیار سے ہندو مذہب کی کُتبِ مقدسہ کی جانچ پڑتال کریں تو ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اسی معیار سے وہ مختلف مذاہب کی جانچ پڑتال کر کے کھوٹے کو کھرے سے جُدا کر دے لیکن مسٹر گاندھی دوسروں سے یہ حق چھین کر آمرانہ طور پر تمام مذاہبِ عالم کو یکساں قرار دیتے ہیں ❖

ہندومت کے مرکب مذاہب

اہل ہنُود کا یہ خیال ہے کہ حق اور صداقت ایک سمندر کی طرح ہے جس میں چاروں طرف سے مختلف دریاؤں کے پانی گرتے ہیں اور اس کو زیادہ گہرا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ زمانہ حال کے تعلیم یافتہ ہندوؤں کا نبی سری ارابندو کہتا ہے :-

"ہر مذہب نے نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچایا ہے۔ چنانچہ بُت پرست مذاہب نے بُت تراشی سے اور اپنی مذہبی رسُوم سے انسان میں خوبصُورتی کی حس بڑھائی ہے۔ مسیحیت نے الٰہی محبّت اور انسانی اُخوّت کا سبق دیا ہے۔ بدھ مت نے پاکیزگی۔ ملائمت اور رحمدلی کی تلقین کی ہے۔ یہودیت اور اسلام نے دینی وفاداری اور مذہبی غیرت کا سبق سکھلایا ہے۔ اگر یہ تمام مذاہب ایک مذہب میں ملا دیئے جائیں تو ایک کارِ عظیم سرانجام پا جائے" ❊

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ہندُو مت میں مختلف اور متضاد عقاید دوش بدوش رہتے ہیں۔ ان کی فلسفیانہ پیچیدگیوں اور منطقیانہ نتائج پر غور وفکر نہیں کیا جاتا۔ تمام مذاہب کو درست سمجھا جاتا ہے پس ہمارے مُلک میں مختلف زمانوں میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مختلف مذاہب کے اچھے اصُولوں کو لے کر ایک نیا مرکّب مذہب جاری کیا جائے تاکہ مذاہبِ جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ اکبر بادشاہ نے دینِ الٰہی جاری کیا تھا جس میں اس نے اسلام ہندُو مت اور مسیحیت کے اصُولوں کو یکجا کیا تھا۔ لیکن یہ دین چند روزہ رہا اور اکبر کی مَوت کے ساتھ ہی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا ❊

(۲)

۱۸۲۸ء میں مرحُوم راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بُنیاد ڈالی۔ اس نے ویدانت۔ اپنشد۔ قرآن اور انجیل میں سے ان اصُولوں کو ایک جگہ کر دیا جو اس کو بھلے نظر آئے۔ وہ ایک عالم شخص تھا جس نے قرآن کا عربی میں اور انجیل جلیل کا یُونانی زبانی میں مطالعہ کیا تھا۔ اس نے

ویدوں کا اور اُپنشدوں کا سنسکرت سے بنگالی زبان میں ترجمہ کیا۔ فارسی میں ایک کتاب "تحفۃ الموحدین" لکھی جو مُورتی پُوجا کے خلاف تھی۔ ایک اور کتاب "نصائحُ مسیح" لکھ کر اپنے ابنائے وطن کو انجیل جلیل کی تعلیم سے واقف کرایا۔ اس بے نظیر شخص نے پچپن سال کی عمر میں برہمو سماج کی بُنیاد ڈالی جس کا اصُول یہ تھا کہ تمام موحد بانیانِ مذاہب کی عزّت اور قدر کی جائے اور ان کی تعلیمات کو بنظرِ وقعت دیکھا جائے۔ ہندو مت کی اصلاح کی جائے اور جس مذہب میں جو تعلیم اچھّی ہو اس پر عمل کیا جائے۔ سماج کے قائم ہونے کے پانچ برس بعد ۱۸۳۳ء میں یہ عالی ہمّت شخص اس دارِ فانی سے رحلت کر گیا ❊

ہمارے مشہور ہم وطن اور مادرِ ہند کے مایۂ ناز سپُوت شاعرِ اعظم ڈاکٹر ٹیگور اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ "ہندُو۔ بُدھ مُسلم اور مسیحی ہندوستان میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نہ ہوں بلکہ چاہئے کہ یہ مذاہب ہمارے ملک میں ایک دوسرے سے مل کر ایک نئی شکل اختیار کر لیں" ❊

(۳)

ان اصحاب کی یہ خواہش ہے کہ ہندو مت اور مسیحیت میں یُوں مصالحت ہو جائے کہ ہندو روایات کا درخت جُوں کا تُوں قائم رہے اور اس میں مسیحیت کا پیوند لگ جائے تاکہ اس میں رُوحانی پھل نمُودار ہو جائیں۔ چنانچہ مسٹر گاندھی نے یہ کوشش کی ہے کہ کلمۃ اللہ کے اصُول کو آپ کی شخصیت سے جُدا کر کے ان کو ہندوستان کی تمدنی اقتصادی اور سیاسی ترقی کا ذریعہ بنا دیں۔ آپ نے منجّیٔ عالمین کے پہاڑی وعظ

کے اصولوں سے ہندومت کے مُردہ قالب میں زندگی کا دم پھونکنے کی ہزار کوشش کی ہے لیکن آپ ناکام رہے کیونکہ ع

گندم از گندم بروید جوز جو

ہندومت کے درخت میں مسیحیت کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ خود کلمتہ اللہ نے فرمایا ہے:۔

"کورے کپڑے کا پیوند پرانی پوشاک پر کوئی نہیں لگاتا نہیں تو وہ پیوند اس پوشاک میں سے کچھ کھینچ لیگا یعنی نیا پرانی سے اور وہ زیادہ پھٹ جائیگی" (مرقس ۲/۲۱)

ہندومت اور مسیحی عقاید کا یکجا ہونا محالِ عقلی ہے۔ کیا برہما یا ذاتِ مطلق یا ذاتِ کل انجیل کا آسمانی باپ ہوسکتی ہے جو کائنات اور انسان سے محبت کرتا ہے؟ کیا الٰہی ذات اور انسانی ذات کی یگانگت محبت کی یکتائی ہوگی یا اُس ذات میں فنا ہونے کی یکتائی ہوگی؟ یہ ظاہر ہے کہ از روئے منطق ان دو مختلف اور متضاد تصوّرات میں مصالحت کا ہونا محض خام خیالی ہے۔ پس خداوند مسیح کی اخلاقی تعلیم اور ہندو نظریۂ کائنات مل کر ایک مرکب نہیں بن سکتا اور اگر بنے گا تو اس کے پاؤں کاٹھ کے پاؤں ہونگے اور مثل مشہور ہے کہ ع

پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

مسیح کی اخلاقی تعلیم مسیح کی ذات اور مسیحی تصوّرِ خدا سے جدا نہیں کی جاسکتی اور مسیحی تصوّرِ خدا مسیحی نظریۂ کائنات کی بنیاد ہے۔ ہندو نظریۂ کائنات اور مسیحی نظریۂ کائنات کا یکجا ہونا اجتماع الضدّین ہے۔

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ ہندو مصلحین انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ہندومت کو اس کے بیہودہ اصولوں سے پاک کرکے کسی نہ کسی طرح اس مُردہ تن میں زندگی کا دم پھونکیں۔ لیکن یہ مصلحین دیگر مذاہب کے اصول کو محض ملمع کاری کی خاطر اس مت کو چلا دینے کے لئے اختیار کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کی کُتب یا اصولوں کو خیرباد کہنے کو تیار نہیں۔ مثلاً برہمو سماج نے اُپنشدوں کو آریہ سماجیوں نے ویدوں کو رام کرشن پرم ہمس کے پیرووں نے اوواریت کو ہندومت کی بنیاد قرار دیا ہوا ہے۔ ہر ایک نے یہ کوشش کی ہے کہ ہندومت کے جنگل میں ایک راہ نکالی جائے جو ہندوؤں کو اس جنگل سے باہر لے جائے۔ لیکن ان کوششوں کو کامیابی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ ہندومت کی پے در پے اصلاحی کوششیں اہلِ ہنود کے عوام کو تسخیر نہ کرسکیں اور نہ انہوں نے ہندو عوام الناس کو متاثر کیا۔ چنانچہ سوا سو سال کے عرصہ میں برہمو سماج والوں کی تعداد کبھی ایک لاکھ سے زائد نہ ہوئی اور رام کرشن کے پیرو صرف چند ہزار نفوس ہیں۔ ہندوستان کی بیچاس کروڑ آبادی میں سے صرف معدودے چند اشخاص کا اصلاح یافتہ ہندومت کے ساتھ تعلق رکھنا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ ان ہندو اصلاحی تحریکوں میں زندگی کا دم نہیں ہے۔ لیکن جب مسیحیت کا پیغام اہلِ ہنود کے عوام الناس میں گیا تو اچھوت ذات کے لوگ متاثر ہوکر جوق درجوق مسیحی کلیسیا میں شامل ہونے لگے۔

(۴)

ہم "مسیحیت کی عالمگیری" کے باب چہارم میں ثابت کر آئے ہیں کہ اگر

کوئی مذہب صرف اعلیٰ ترین اصولوں کا مجموعہ ہونے پر ہی کفایت کرتا ہے تو اُس میں یہ صلاحیت نہیں رہتی کہ وہ بنی نوع انسان کو طاقت قوت اور توفیق عطا کرے اس قابل بنا سکے کہ وہ ان اصولوں پر چلیں۔ مجرد اصُول اور احکام کا وجود نجات نہیں دے سکتا کیونکہ مجرد اصُول اس بات کے اہل نہیں ہو سکتے کہ وہ کسی گنہگار انسان کی کھوئی ہوئی قوتِ ارادی کو از سرِ نو بحال کر سکیں۔ اعلےٰ ترین اصُول اور احکام ہدایت کا رستہ بتلا سکتے ہیں۔ نیک اور بد میں تمیز کر کے انسان کو کسی نیک نصب العین کا راہ دکھا کر نصیحت کر سکتے ہیں کہ وہ اُس پر چلے لیکن مجرد اصُول یہ اثر اور توفیق نہیں عطا کر سکتے کہ کسی گنہگار شخص کو اُس کے گناہوں سے چھٹکارا دلوا کر اس کو ان پر غالب آنے کا فضل بخش سکیں۔ مجرد اصول اپنے اندر یہ اثر اور طاقت نہیں رکھتے کہ گنہگار شخص کی مُردہ قوّتِ ارادی میں اپنا مسیحائی دم پھُونک کر نئی جان ڈال دیں۔ چنانچہ "بھاگوت گیتا" میں ارجن کہتا ہے :-

"اے کرشن۔ میرا من نہایت بے چین ہے۔ وہ تُند رَو ہے اور نہایت ہی سرکش ہے اور میرے بس کا نہیں رہا۔ میرے لئے اس کو روکنا ایسا ہی مشکل اور دشوار ہے جیسے آندھی کو" (۶/۳۴)

اور کرشن جی خود اقبال کرتے ہیں کہ :-

"ہزاروں انسانوں میں سے بمشکل ایک انسان ایسا ہوتا ہے جو کمالیت کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ہزاروں اہلِ کمال میں سے بصد مشکل ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو میری حقیقت سے واقف ہوتا ہے" (۷/۳)

پس برہمو سماج اور اس قسم کے دیگر تمام مرکّب مذاہب مثلاً بہائی مذہب وغیرہ جو مجرد احکام ہدایات ارشادات اور اصُول کا مجمُوعہ ہوتے ہیں اپنے اندر زندگی نہیں رکھتے اور نہ وہ اپنے مقلدین کو زندگی عطا کر سکتے ہیں ✣

(۵)

علاوہ ازیں کسی مذہب کی ساخت اس قسم کی نہیں ہوتی کہ اُس کے ایک جُز کو نکال کر دوسری جگہ لگایا جا سکے۔ مذہب ایک ایسا کُل ہوتا ہے جس کے اجزا میں وہی تعلق ہوتا ہے جو بدن اور اُس کے اعضا میں ہوتا ہے۔ ہم ایک بدن کی ٹانگ اور دوسرے کے بازو اور تیسرے کا سر اور چوتھے کا دھڑ اُن کے جسموں سے الگ کر کے ایک نئے انسان کا جسم نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح ہم ہندو مذہب کا اچھا اصُول چھانٹ کر اور اسلام کا ایک دوسرا اصُول چُن کر اور مسیحیت کا ایک تیسرا اصُول لے کر اور اُن کو باہم یکجا کر کے ایک زندہ مذہب نہیں بنا سکتے۔ یہ مختلف اصُول ایک دوسرے سے بے ربط اور بے جوڑ کاٹے ہوئے اعضا کی طرح مُردہ ہوں گے اور اس ایجاد کردہ مرکّب مذہب میں یہ صلاحیت نہیں ہوگی کہ وہ کسی میں زندگی کا دم پھُونک سکے ✣

(۶)

بین الاقوامی جماعت International Fellowship کا ساتواں جلسہ دسمبر ۱۹۳۹ء میں ہُوا۔ اس جلسہ میں یہ قرار پایا کہ مختلف مذاہب کا اختلاف اس وجہ سے ہے کہ وہ مختلف پہلوؤں پر تاکید سے زور دیتے ہیں اور ہر مذہب کی خصُوصیت اس تاکید کا نتیجہ ہے پس کسی مذہب کی خصُوصیت اُس خاص مذہب کے ساتھ مخصُوص نہیں ہونی چاہئے۔

بلکہ ہر ایک مذہب کی خصوصیات کو تمام مذاہب عالم کا ایک حصہ تصوّر کرنا چاہئے
ہر مذہب کو چاہئے کہ دیگر مذاہب کو اپنی خصوصی تعلیم اور دیگر خصوصیتوں
میں شریک کرے۔ اس جلسہ کے خیال میں اس قسم کے طریقِ عمل سے
تبدیلیٔ مذہب کی بھی ضرورت جاتی رہیگی ۔

تبدیلیٔ مذہب کے مخالفین کو چاہئے کہ اپنے خیالات کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ مذکورہ بالا فقرات اس بات کے شاہد ہیں کہ ان اصحاب نے اپنے خیالات کی تنقیح و تنقید کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اوّل یہ بات غلط اور حقیقت کے خلاف ہے کہ مذاہب کا اختلاف محض کسی خاص پہلو پر زور دینے اور اُس پر تاکید کرنے کی وجہ سے ہے۔ مثال کے طور پر بُدھ مت۔ ہندو مت اسلام اور مسیحیت کے بنیادی اصول کو لیں۔ کیا یہ سچ ہے کہ ان کے بُنیادی اصُول ایک ہی ہیں اور اختلاف محض مختلف پہلوؤں پر تاکید دینے کی وجہ سے ہے؟ ہر شخص جو ان مذاہب سے سطحی واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ ان مذاہب کے باہمی اختلافات بُنیادی اور اصُولی ہیں۔ دوم۔ یہ بُنیادی اختلافات ان مذاہب کی خصُوصیات میں سے ہیں اور یہ حدِ فاصل کا کام دیتے ہیں۔ ان اصُولی اختلافات کی وجہ سے اسلام کے ارکان مذاہب ہندو مت کے ارکان سے جُداگانہ ہیں اور مسیحیت اپنی خصوصی تعلیم کی وجہ سے دیگر مذاہب سے مختلف ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی مذہب کی خصُوصی تعلیم اس کا امتیازی نشان ہے۔ دریں حال اس اجلاس کی قرارداد کے الفاظ کہ کسی مذہب کی خصُوصی تعلیم اس کی خصُوصیت کا حصّہ نہیں ہونی چاہئے بلکہ ہر مذہب کو چاہئے کہ دیگر مذاہب کو اپنی خصُوصی تعلیم اور دیگر خصائص

میں شامل اور شریک کرے"۔ اجتماع الضدّین اور خرافات کا مجموعہ ہیں ۔

(۷)

ہمیں یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ مختلف مذاہب عالم ایک ہی سوال کے مختلف جوابات نہیں بلکہ مختلف سوالات کے مختلف اور متضاد جوابات ہیں پس وہ کسی فلسفہ کے اصُول کے مطابق ایک ہی نظام میں منظم نہیں کئے جا سکتے۔ مثلاً اہلِ یہود کی کُتب گُناہ کے احساس سے پُر ہیں اور وہ اس سوال کا جواب ہیں کہ گُناہ سے نوعِ انسانی کس طرح نجات حاصل کر سکتی ہے؟ لیکن اہلِ ہنود کی مذہبی کُتب ویدانپشد اور بھاگوت گیتا میں گُناہ کا احساس نمایاں نہیں۔ اس کے برعکس ان کی نظر میں گُناہ مایا ہے۔ اہلِ ہنُود کو گُناہ کا بوجھ نہیں ستاتا بلکہ وہ سنسار کی غلامی کو محسوس کرتے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کرم سے کس طرح رہائی حاصل کر سکتے ہیں؟ وہ گُناہ سے نہیں بلکہ جنم لینے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن جی کہتے ہیں :-

"وہ جو جنم اور مرن سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔
۔۔ وہ نجات پاتے ہیں" (۷/۲۹) جب وہ جو جسم کے اندر رہتا ہے
تینوں گُنوں کو چھوڑ دیتا ہے اور جنم اور مرن دُکھ اور ضعیفی سے
چھُٹ جاتا ہے۔ وہی امرت جل پیتا ہے"۔ (۱۴/۲۰)

یہی حال دیگر مذاہب کا ہے۔ ہم منطق کے کس اصُول سے بُدھ مت کی اگناسٹک فنائیت۔ ویدوں کی فطریت۔ اہلِ یہود کے خدا کی احدیت

قرآن کی شریعت اور انجیل کے خدا کی محبت کو ایک ہی نظام میں منظم کر سکتے ہیں؟ ان مختلف مذاہب میں اگر ایک کا منہ مشرق کی طرف ہے تو دوسرے کا مغرب کی طرف ہے وہ ایک ہی قطار میں کس طرح ہمدوش ہو کر ایک ہی رُخ چل سکتے ہیں؟

بعض اوقات ہم کو مسیحیت اور ہندوازم میں ایک ہی طرح کے مشترکہ الفاظ ملتے ہیں جس سے انسان کو اس قسم کا دھوکا ہو سکتا ہے مثلاً دونوں تجسّم کے قائل ہیں لیکن جب ہم ان مشترکہ الفاظ کی تہ کو پہنچتے ہیں تو ہم کو آسمان اور زمین کا فرق نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر تجسّم اور اوتاروں کے سوال کو لیں۔ ہندومت انسان کو خدا بتلاتا ہے لیکن مسیحیت اس کے برعکس کہتی ہے کہ خدا نے انسانی شکل اختیار کی۔ ہندومت انسان کو خدا بنا کر اُس میں تکبّر اور غرور پیدا کرتا ہے اور اُس کی اخلاقی اور مذہبی حس کو مُردہ کر دیتا ہے۔ لیکن مسیحی عقیدہ انسانی زندگی کے ہر شُعبہ کی تقدیس کرتا ہے۔ ہمارے مبارک خداوند کے الفاظ "میں اور باپ ایک ہیں" (یوحنا ۱۰/۳۰) انسانی رُوح کے اعلیٰ ترین معراج کا اظہار ہیں لیکن رام کرشن پرم ہمس اور سوامی ویویکانند کے الفاظ جن کا سطور بالا میں اقتباس کیا گیا ہے اس روحانی حالت کی عین ضد ہیں۔ مسیحیت کا خدا کوئی مجرّد تصوّر نہیں بلکہ "عمانوئیل" ہے یعنی "خدا ہمارے ساتھ"۔ علاوہ ازیں ہندوؤں کے اوتاروں کے آنے کی غرض اور مسیح کے مجسّم ہونے کی غرض میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن کہتا ہے:-

جب کبھی دھرم میں زوال ہوتا ہے اور ادھرم کا سر اُونچا ہوتا ہے۔ اُس آن میں اوتار کا روپ دھار کر دُنیا میں آتا ہوں تاکہ راستباز

کی حفاظت کروں اور گنہگاروں کا ناس کروں۔ دھرم کو مستحکم کرنے کی خاطر میں بار بار جنم لیتا ہوں ... میں کسی سے نفرت نہیں رکھتا اور نہ میں کسی سے محبّت کرتا ہوں" (چوتھا باب)

لیکن خداوند مسیح نے اس دُنیا میں جنم لیا تاکہ گنہگاروں کو بچائے "خدا نے دُنیا سے ایسی محبّت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے" (یوحنا)

پس مختلف مذاہب کو ہم نہ اصُول کے لحاظ سے نہ ان کی اصطلاحات کی سطحی مشابہت کی وجہ سے ایک نظام میں منظم کر کے ایک نیا مرکّب مذہب ایجاد کر سکتے ہیں +

(۸)

اگر تمام مذاہب انسانی کوششوں کا نتیجہ ہوتے تب یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ ہم مختلف ممالک واقوام کے تجربوں اور اصُولوں کو یکجا کر کے اُن کو کانٹ چھانٹ کر ایک نیا مذہب بنا سکتے جو مختلف اصولوں کا معجونِ مرکّب ہوتا۔ لیکن جیسا ہم سطور بالا میں بتلا چکے ہیں مذہب انسانی ایجاد کا نام نہیں اور نہ وہ کسی انسان نے بنایا ہُوا ہے۔ مذہب انسانی مساعیٔ جمیلہ کا مرہونِ احسان نہیں ہوتا بلکہ حقیقی مذہب خدا کی بخشش ہے جس کو ہم ایمان کے وسیلے حاصل کرتے ہیں۔ بالخصوص مسیحیت خدا کا مکاشفہ ہے۔ وہ ایک مافوق الفطرت شے ہے جس کا وجُود انسانی فطرت پر منحصر نہیں ہے۔ "جو اُوپر سے آتا ہے وہ سب سے اُوپر ہے جو زمینی ہے وہ زمین ہی سے ہے اور زمین ہی کی کہتا ہے"۔ (یوحنا ۳/۳۱) دیگر مذاہب میں اور مسیحیت میں اس لحاظ سے بعد المشرقین ہے۔ دیگر مذاہب کے بغیر

بھی انسان خُدا کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن مسیحیت کے بغیر خُدا کی معرفت اور اس کا حقیقی علم ناممکن امر ہے۔ مسیحی ایمان کے اجزا ایسے نہیں کہ ان کے ساتھ انسان جو چاہے سو کرے یا ایک جزو کی جگہ دوسرا پیوند کر دے۔ وہ ایک انجیل ہے جس کی منادی تمام اقوام عالم میں کی جاتی ہے۔ وہ ایک خُوشی کی خبر ہے کہ خُدا خود گنہگار کی خاطر مجسّم ہُوا ہے۔ وہ ایک پیغام ہے جو رُوئے زمین کے افراد کے لئے ہے۔ جس طرح خُوشی کی خبر اور پیغام میں کتر بیونت نہیں کی جا سکتی اسی طرح مسیحیت میں کتر و بیونت کا امکان نہیں ہے۔ ہر مسیحی کا فرض ہے کہ اس بشارت کے پیغام کو تمام و کمال دُنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچائے چونکہ کوئی مسیحی مسیح کے بغیر خود زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا وہ اس خیال کو بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے ابنائے جنس جو اس کے گوشت اور خُون ہیں مسیح کے بغیر زندگی بسر کریں +

بابِ دوم

ہندُو فلسفہ اور مذہبی رواداری

ہم نے گذشتہ باب میں یہ بتلایا تھا کہ جو لوگ ہندو دائرہ میں ہیں اُن کے لئے کسی خاص عقیدہ کا پابند ہونا لازم نہیں۔ ویدوں کا ماننے والا ہندُو ہے اور اُن کو نہ ماننے والا بھی ہندُو کہلاتا ہے۔ کروڑوں دیوتاؤں کو ماننے والا ہندُو اور ایک خُدا کو ماننے والا بھی ہندو۔ اور خُدا کے وجُود سے انکار کرنے والا بھی ہندُو کہلاتا ہے۔ اپنشدوں اور سمرتیوں کو ماننے والا اور نہ ماننے والا بھی ہندُو کہلاتا ہے۔ گئو رکھشا کرنے والا بھی ہندُو اور مسٹر گاندھی کی طرح گائے کو مروا ڈالنے والا بھی ہندُو کہلاتا ہے۔ پس ان کے لئے تمام مذاہب یکساں اور برابر ہوتے ہیں۔ ویدوں کے ماننے والے کے مذہب کو اُن کو نہ ماننے والوں پر فوقیت نہیں۔ ایک خُدا کو ماننے والے کا مذہب بُت پرست کے مذہب سے بہتر نہیں ہوتا +

ہندو فلسفہ کا بھی امتیازی نشان مذہبی رواداری ہے۔ ہندُو[1] فلسفہ عام طور پر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ناستک اور آستک۔ ناستک فلسفہ ویدوں کو الہامی نہیں مانتا اور تین قسم کا ہے۔ بُدھ ناستک۔ جین ناستک اور

[1] See Das Gupta, History of Indian Philosophy Vol: I

چارواک ناستک۔ آستک فلسفہ چھ قسم کا ہے۔ (۱) کپل کا سمکھیا اور (۲) پاتنجلی کا یوگ سوتر۔ اگرچہ یہ دونوں فلسفے بعض باتوں میں متفق ہیں لیکن یوگ سوترا ایشور کو آتما سے الگ شے مانتا ہے اور یوگ عمل پر زور دیتا ہے پر سمکھیا ایشور کو نہیں مانتا۔ (۳) جیمنی کا پورو میمانسا درحقیقت فلسفہ نہیں ہے کیونکہ وہ ویدوں کے اُس حصّہ کی شرح ہے جس کا تعلق قربانیوں کے ساتھ ہے۔ (۴) اُتر میمانسا یا ویدانت سوتر یا برہم سوتر۔ لفظ ویدانت کے معنی ہیں "وید کا آخر" یعنی اُپنشد۔ اس فلسفہ میں اپنشدوں کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ اس کی سب سے قدیم شرح شنکر آچاریہ کی شرح ہے۔ اور وہ اتنی مقبول ہے کہ بالعموم ویدانت سے مطلب شنکر کی شرح سے لیا جاتا ہے جو ہمہ اوستی خیالات کے مطابق لکھی گئی ہے لیکن دوسرے لوگوں نے برہم سوتر کی جو شرح لکھی ہے اور جس کو وشنو اور شیو اور راماینت وغیرہ مانتے ہیں وہ ہمہ اوستی خیالات کے خلاف ہے کیونکہ وہ ثنویت کے قائل ہیں اور خدا اور دُنیا کو ایک ماننے کی بجائے دو مختلف ہستیاں مانتے ہیں۔ ان لوگوں میں رامانج۔ ولبھ۔ مدھو۔ سری کنٹھ وغیرہ مشہور شارع ہیں جنہوں نے برہم سوتروں کی ایسی تشریح کی ہے جو شنکر کی شرح کے متضاد ہے۔ ان میں سے رامانج کا فلسفہ زیادہ مشہور ہے۔ (۵) گوتم کا نیائے سوتر منطق پر اور (۶) کناڈ کا ویشیشکھا سوتر علم طبیعات اور علم بعد الطبیعات پر زور دیتا ہے +

مندرجہ بالا مختصر بیان سے ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ جس طرح ہندو مت کے کوئی مخصوص عقاید نہیں۔ اسی طرح ہندو فلسفہ اصولوں کے کسی خاص مجموعہ کا نام نہیں جس طرح ایک ہندو مذہبی امور میں جس اصول

کو چاہے مان سکتا ہے اور جس کا انکار کرنا چاہے کر سکتا ہے اسی طرح فلسفیانہ امور میں ہندو جس اصول کو چاہے مان سکتا ہے اور جس کا انکار کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ وہ کسی مذہب یا اصول کا پابند نہیں ہوتا۔ پس اس کے لئے ہر قسم کے مذاہب اور ہر قسم کے فلسفیانہ خیالات برابر ہوتے ہیں +

یہاں ہم ہندو فلسفہ کی تفصیلی بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ہم کو اس رسالہ میں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہندو فلسفیانہ خیالات کا اثر ہمارے موضوع پر کیا ہے؟ فلسفیانہ خیالات کے اختلاف کے باوجود بالعموم ہندو فلسفہ سے مُراد شنکر کی ویدانت لی جاتی ہے اور ہندو فلسفہ کے اصول سے کرم اور تناسخ کے اصول مُراد ہوتے ہیں۔ پس ہم اس باب میں صرف ان پر بحث کرنے پر اکتفا کریں گے۔ اس بحث سے ہمارا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہندو مذہب و فلسفہ کے اصول قرآنی اور انجیلی اصول سے جُدا اور مختلف ہیں اور یہ اختلاف اس قسم کا ہے کہ دونوں قسم کے اصول برابر طور پر صحیح اور درست نہیں ہو سکتے اور چونکہ یہ اصول ایک دوسرے سے کلیتہً متضاد ہیں۔ لہٰذا دونوں کا صحیح ہونا محال عقلی ہے۔ اگر ہندو مت کے اصولِ فلسفہ فی الحقیقت درست ہیں تو مسیحیت کے اصول باطل ہیں۔ لیکن اگر مسیحیت کے اصول درست ہیں تو ہندو فلسفہ کی بُنیادوں کے غلط ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی +

(۲)

ہندو فلسفہ ہمہ اوستی مذہب ہے اور بالفاظ پروفیسر سور لے

(Sorley) اس مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ :-

"ہر انفرادی شے اپنی اپنی جگہ پر اپنے مخصوص طور و طریقہ سے اُس وحدت الوجود کی مظہر ہے جو کُل بھی ہے۔ اس کُل میں ایک ایک شے کی جگہ مقرر ہے اور یہ جگہ اس کے وجود کے لئے لازمی ہے خواہ وہ شے مادی ہو یا وہ رُوح سے متعلق ہو۔ خواہ وہ انسان ہو یا کیڑا ہو۔ خواہ وُہ ایک مقدس فرد ہو یا وہ گنہگار ہو"۔

چُونکہ اس وحدتِ کُل میں ہر ایک شے اپنے مخصوص طریقے سے وجُودِ مُطلق کی مظہر ہے اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ سب مذاہب اپنی اپنی جگہ یکساں طور پر حق اور راست تسلیم کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے مایۂ ناز فلاسفر اور مسلم الثبوت اُستاد پروفیسر سر رادھا کرشن کہتے ہیں :-

"مختلف مذہبی روایات درحقیقت مختلف زبانیں ہیں جن کے ذریعہ مذہب کی حقیقت پیش کی جاتی ہے۔ اگرچہ زبانوں میں اختلاف ہے تاہم سب کا مفہوم ایک ہی ہوتا ہے۔ عبادت کے تمام طریقے مؤثر اور با معنی ہیں خواہ بظاہر وہ ہم کو لغو اور بے معنی خرافات ہی نظر آئیں"۔ Idealist View of Life, p. 119-22

اس نامور فلاسفر کے خیال میں ہندو مت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ :-

"وہ صلح آمیز نظر سے ہر ایک بات کو قبول کر لیتا ہے اور کسی ایک جامد عقیدہ پر وارفتہ ایمان نہیں رکھتا"۔

Hindu View of Life, p. 58

اِسی کتاب میں ایک اور جگہ آپ فرماتے ہیں :-

"ہندو مت شامی مذاہب کی اس دیوانگی سے پاک ہے کہ نجات صرف کسی ایک مذہب میں ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے چند مخصوص عقائد کا ماننا لازمی ہے کیونکہ ان کا منکر جہنم کا سزاوار ہو جاتا ہے"۔

پروفیسر صاحب موصوف کے خیالات ہندو فلسفہ اور ہندو مذہب کے اُصُول یا قضایا کے منطقی نتائج ہیں۔ اگر ہمہ اوستی قضایا کو مان لیا جائے تو مذہبی مصالحت اور رواداری ایک ایسی بدیہی بات ہو جاتی ہے جو ثبوت کی محتاج نہیں رہتی۔ چونکہ ہر شے اپنی اپنی جگہ اپنے مخصوص طور و طریقہ سے ایک ہی کُل کی مظہر ہے لہذا ہر مذہب اپنی اپنی جگہ قابلِ قدر ہے اور تمام مذاہب کے بانی اور ان کے اصُول اپنے اپنے مخصوص طریقہ سے اُسی ایک کُل کے مظہر ہیں لہذا وہ یکساں طور پر وقعت کے قابل ہیں اور کسی مذہب یا اس کے بانی کو کسی دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ÷

پروفیسر رادھا کرشن کا یہ خیال ہے کہ جس طرح کسی زمانہ میں سیاسی دُنیا میں ایک جمعیت الاقوام کا وجود تھا اسی طرح مذاہبِ عالم کی ایک فیڈریشن یا وفاق (جمعیت المذاہب) ہونی چاہئے۔ لیکن پروفیسر صاحب اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ جمعیت الاقوام میں تمام اقوام کی حیثیت یکساں ہوتی ہے اور وہ سب سیاسی طور پر خُود مختار ہوتی ہیں۔ لیکن جب مذاہبِ عالم میں بُنیادی اور اصولی فرق ہیں تو ان کا پلہ یکساں نہ رہا۔ پس بعض مذاہب راست اور بعض باطل ہوئے۔ جمعیت المذاہب کے وجود کے لئے لازم ہے کہ تمام مذاہب یکساں طور پر اقوام عالم کی طرح خود مختار ہوں اور ان کے بُنیادی اصُول ایک ہی ہوں۔ ہم گذشتہ باب

ہیں دیکھ چکے ہیں کہ ادیانِ عالم کا کسی ایک اصُول پر بھی اتفاق نہیں ہے۔ دریں حالت ہم مذاہبِ عالم کے مجمع کثیر کو جمعیت المذاہب کی ایک لڑی میں کس طرح منسلک کر سکتے ہیں؟ جرمن فلاسفر بیرن فون ہیوگل Baron Von Hugel, درست کہتا ہے کہ :-

"یہ بات غلط ہے کہ تمام مذاہب یکساں طور پر درست ہیں اور یکساں طور پر پاکیزہ ہیں اور یکساں طور پر پھلدار ہیں"۔

حق تو یہ ہے کہ مسیحیت ہندومت کی طرح ایک فلسفہ نہیں بلکہ وہ انجیل یعنی خوش خبری ہے۔ وہ ہر کس و ناکس کے لئے جو نفسِ امارہ کا غلام ہو چکا ہے ایک بشارت کا پیغام ہے جو اس کو بتلاتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ سے

حکمت و فلسفہ کار یست کہ پایانش نیست ✣ سیلی عشق و محبت بہ دبستانش نیست۔ اقبال

ہندومت کے برعکس مسیحیت ایک مکاشفہ ہے جو کامل ہے اگرچہ ہمارے فہم اس کو کامل طور پر سمجھنے سے قاصر ہوں لیکن ہمارے ادراک اور فہم کے ناکامل ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مکاشفہ بھی غیر مکمل ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہم خُدا کی ذات کو نہیں جان سکتے۔ لہٰذا ان کو اس بات میں مطلق تامل نہیں ہوتا کہ وہ مسیح کو یا کرشن کو یا شو کو یا رام کو یا کالی کو خُدا مان لیں لیکن مسیحیوں کے نزدیک مسیح ان لاتعداد مظہروں میں سے خُدا کا ایک مظہر نہیں ہے۔ بلکہ ان کا یہ ایمان ہے کہ خُدا نے اپنی ذات کا کامل مکاشفہ عطا کیا ہے جو صرف مسیح یسُوع اور صرف مسیح یسُوع میں ہے۔ لہٰذا وہ ان تمام اقوال کو فرضی اور غیر مکمل جان کر ان کو رد کرتے ہیں ✣

خُدا اور کائنات کا رشتہ

گذشتہ باب میں ہم اشارہ کر چکے ہیں

کہ ہندوستان کے تین بڑے مذاہب یعنی ہندوازم۔ اسلام اور مسیحیت میں بنیادی اور اصُولی فرق ہے اور چونکہ ان میں اصُولی فرق ہے لہٰذا وہ تینوں یکساں طور پر صحیح نہیں ہو سکتے۔ مثلاً اگرچہ تینوں مذاہب اپنے اپنے مخصُوص عقائد کے مطابق خُدا کو مانتے ہیں تاہم خُدا کی ذات وصفات کی نسبت اُن کے تصوّرات میں بعد المشرقین ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ خُدا اور کائنات کے درمیان کیا رشتہ اور تعلق ہے تو ہندومت اور اسلام اور مسیحیت کے جوابات مختلف اور متضاد ہونگے۔ اگر ہندوازم یا اسلام کا جواب درست ہے تو مسیحیت کا جواب لاکلام غلط ہوگا لیکن اگر مسیحیت کا جواب درست ہے تو ہندومت اور اسلام کے جوابوں کے غلط ہونے میں کسی قسم کی گنجائش نہیں رہ سکتی کیونکہ اصولِ منطق کے مطابق اجتماع الضدین محالِ عقلی ہے۔ انشاء اللہ اس باب میں ہم یہ ثابت کر دکھائینگے کہ مذکورہ بالا سوال کے جوابات میں سے صرف مسیحیت کا جواب ہی اصُولِ منطق و فلسفہ کے مطابق راست اور درست ہے اور ہندوازم اور اسلام کے جوابات غلط ہیں ✣

——— (۱) ———

خُدا اور کائنات کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس سوال کے تین مختلف اور متضاد جواب ہیں:-

پہلا جواب یہ ہے کہ خُدا کائنات میں ساری و طاری ہے جو کچھ ہم کو حواس کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے سب اُس کا مظہر ہے۔

ع جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

اُس کی ذات اِس کائنات کے علاوہ اور اِس کے باہر موجود

نہیں۔ ہمہ اوست یہ جواب ہندو مت کا ہے۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن کہتے ہیں :-

میں سب کو کرنے والا بُود ہوں اور نابُود ہوں۔ سب سے اعلےٰ مالک اور مختار ہوں۔ مجھ میں سب عالم اس طرح گوندھا پڑا ہے جس طرح منکے کسی ہار میں پروئے ہوتے ہیں۔ میں آب میں رس ہوں۔ انسان میں طاقت ہوں۔ مہرو ماہ میں نُور ہوں۔ ویدوں میں اونکار ہوں۔ اکاش میں شبد ہوں۔ مٹی میں خُوشبو ہوں۔ آتش میں جلن ہوں۔ سب عالم میں جان ہوں۔ میں خود ہی عابد ہوں خُود ہی معبود ہوں اور خود ہی عبادت ہُوں۔ داناؤں میں دانائی ہوں۔ موجودات میں تخم ہوں۔ حشمت والوں میں حشمت ہوں۔ طاقت ور میں طاقت ہوں انسان میں شہوات ہوں"۔ (۷ : ۶ تا ۱۱)

دوسرا جواب یہ ہے کہ خُدا کی ذات ایسی منزہ صفات ہے کہ وہ مخلوقات سے کلیتہً بالا اور برتر ہے۔ خُدا ایک ایسی پاک ہستی ہے کہ اُس کے ساتھ کائنات کی کامل رفاقت ناممکن اور محال ہے یہ جواب اسلام کا ہے ✤

پہلے جواب کے مطابق فطرت اور مافوق الفطرت میں کوئی امتیاز نہیں۔ سب کچھ اُسی کا ظہور ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مذہب کا یہ کام ہے کہ کثرت کے پردے کو چاک کر دے اور انسان کو وحدت کی حقیقت تک پہنچا وے۔ تغیرات کا یہ عالم مایا ہے۔ اور یہ دھوکا نہ صرف ہماری انفرادی زندگی میں بلکہ کائنات میں بھی پایا جاتا ہے۔ مذہب کا یہ کام ہے کہ اس دھوکے اور سراب کو دُور کر کے ہم کو وحدت الوجود سے ملا دے

لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر خُدا اپنی کائنات میں ساری وطاری ہے تو ہم ایسی ہستی کے ساتھ کسی قسم کی حقیقی رفاقت نہیں رکھ سکتے۔ ہندو فلسفہ کے نزدیک نوع انسانی اُس مسرف بیٹے کی طرح ہے جو اپنے باپ کے گھر سے دور مایا کی پھلیوں سے اپنا پیٹ بھرتا ہے لیکن جب وہ باپ کے گھر واپس جانے کا ارادہ کرتا ہے تو باپ کا گھر خالی پڑا دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی باپ ہے نہیں جو اپنے گم گشتہ بیٹے کو گلے لگالے۔ ہمارا اور ذات مُطلق کا وجود ایک ہی ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کے ساتھ رفاقت نہیں رکھ سکتا۔ پس اس قسم کے رشتہ کو لفظ "رفاقت" سے منسُوب کرنا درحقیقت الفاظ "رفاقت" اور "رفیق" کو توڑ مروڑ کر ایک بے معنی لفظ بنا دینا ہے ✤

اگر دوسرا جواب یعنی اسلام کا جواب صحیح ہے کہ خُدا کی ذات اس قدر منزہ صفات واقع ہوئی ہے کہ وہ کائنات سے کلیتہً برتر و بالا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ انسان ایسی صفات رکھنے والی ہستی سے کسی طرح بھی حقیقی رفاقت نہیں رکھ سکتا۔ قرآن کا خُدا ایک ایسا ہیبت ناک مطلق العنان بادشاہ ہے جس کے سامنے انسان لرزہ باندام رہتا ہے۔ آقا اور غلام میں کوئی حقیقی رفاقت نہیں ہو سکتی۔ خُداوند مسیح نے کیا خُوب فرمایا ہے :-

"غلام نہیں جانتا کہ اس کا مالک کیا کرتا ہے" (یوحنا ۱۵ : ۱۵)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں مختلف اور متضاد نظریہ ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خُدا اور انسان میں باہمی رفاقت امر محال ہے۔ کیونکہ ہمہ اوستی ادوائت ویدانت اصُول کے مطابق صرف خُدا یا برہما ہی حقیقی وجود رکھتا ہے اور باقی تمام چیزیں جن کا تعلق زمان و مکان کے

ساتھ ہے مایا اور دھوکا ہیں۔ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

اسلام کے مطابق خُدا اپنی کائنات سے اس قدر بلند و بالا اور برتر ہے کہ اس کی حقیقت کے سامنے انسانی زندگی کی کچھ حقیقت یا قدر و قیمت نہیں رہتی۔ پس تمام اشیا جن کا تعلق زمان و مکان کے ساتھ ہے بے حقیقت ہیچ اور بے معنی ہو جاتی ہیں۔ خُدا اور انسان کے درمیان رفاقت بے معنی ہو جاتی ہے کیونکہ خالق کی ازلی مرضی اور اٹل ارادہ کے سامنے مخلوق کی فانی مرضی اور انسانی ارادہ کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی ۞

اگر خُدا کائنات سے صرف برتر و بالا ہے اور اس کی طرف سے بے نیاز اور بے پرواہ ہے تو اُس کی ہستی محض ایک تماشہ بین یا ناظر کی سی ہے جس کا کام عالمِ شہود کا مشاہدہ کرنا ہے اور بس۔ کیا اس قسم کا الٰہی تصوّر ہماری روحانی جدوجہد میں ممد و معاون ہو سکتا ہے؟ کیا اس میں یہ طاقت ہو سکتی ہے کہ ہماری کشمکش میں ہم کو راست نصب العین کو حاصل کرنے کی جانب راغب کر سکے؟

(۳)

تیسرا جواب مسیحیت کا جواب ہے۔ مسیحیت کا یہ عقیدہ ہے کہ خُدا نے اس کائنات کو اپنے کلام کے ذریعہ خلق کیا ہے (یوحنا ۱/۳) وہ کائنات کے اندر ہے (یرمیا ۲۳/۲۴) اور اس سے بلند و بالا اور پرے بھی ہے (زبور ۸۳/۱۸) گو تمام مخلوق خُدا میں جیتے اور چلتے پھرتے ہیں اور اسی میں وجود رکھتے ہیں (اعمال ۱۷/۲۸،۲۴) تاہم خُدا اور کائنات کا باہمی تعلق کُل اور جُز کا سا نہیں ہے۔ خُدا اس کائنات میں ساری اور طاری ہے اور ساتھ ہی ماورا لورا

بھی ہے۔ وہ ایک ایسی وحدت اور واحد ہستی ہے (استثنا ۶/۴) جو غیر شخصی نہیں ہے بلکہ جو شخصیت کی صفات ہم میں محدود طور پر موجود ہیں وہ محض اس وجہ سے ہیں کیونکہ وہ خدا میں لامحدود طور پر موجود ہیں۔ خُدا روح ہے (یوحنا ۴/۲۴) اور اس کی ذات محبت ہے (۱-یوحنا ۴/۸،۱۶) وہ ایک کامل ہستی ہے (متی ۵/۴۸، زبور ۹۹/۹ وغیرہ) برحق ہے (یو ۱۷/۳) نیکی کا سرچشمہ اور سراسر نیک ہے (زبور ۲۵/۸ ۔ متی ۱۹/۱۷ وغیرہ) اگرچہ وہ ذاتِ مطلق قادر، قدیم وحدہٗ [illegible] علیم، خبیر اور ہر جا حاضر و ناظر ہے (زبور ۱۳۹/۱-۷) تاہم اس نے انسان کو ایک خود مختار ہستی ہونے کی عزّت بخشی ہے۔ اور اس کو فاعلِ خود مختار بنا کر اس بات کا اہل بنایا ہے کہ وہ خُدا کے ساتھ حقیقی رفاقت رکھ سکے۔ یہ ذاتِ مطلق کوئی مجرد تصوّر نہیں بلکہ یہ واجب الوجود ہستی بنی نوع انسان کا باپ ہے (متی ۶/۹ وغیرہ) جس نے ایمانداروں کو اپنے فرزند ہونے کا حق بخشا ہے (یو ۱/۱۲) پس کُل دُنیا کے ایماندار خواہ وہ کسی مُلک قوم نسل یا رنگ کے ہوں خُدا باپ کی رفاقت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس رفاقت کی مثال ایسی ہے جیسی دُنیاوی باپ اور بیٹے میں رفاقت ہوتی ہے۔ یعنی یہ رفاقت دو آزاد فاعلِ خود مختار ہستیوں میں رفاقت ہے۔ پس وحدت اور وجود بنی نوع انسان کے لاتعداد افراد کے ساتھ حقیقی رفاقت رکھتا ہے۔ کائنات کی کثرت دھوکا اور سراب یا مایا نہیں بلکہ اس کثرت کا وجود خارجی حقیقت رکھتا ہے اور اشرف المخلوقات میں حقیقی طور پر یہ صلاحیت موجود ہے کہ خُدا کے ساتھ بغیر اپنی ذات کو قائم بالذات میں فنا کئے حقیقی رفاقت رکھ سکے۔

"ہماری رفاقت باپ کے ساتھ اور اس کے بیٹے یسوع مسیح کے ساتھ

ہے" (۱-یوحنا ۱/۴)

مشہور جرمن فلاسفر پروفیسر آٹو ہم کو بتلاتا ہے کہ:-

"ہر ملک میں وہ تمام مذہب جن کی بنیاد محض عقل یا اخلاقیات پر ہے سسکیاں بھر رہے ہیں اور صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ وہ مذہب لے رہا ہے جس کی بنیاد روحانیات پر ہے کیونکہ ان میں سرے سے وہ اپیل موجود نہیں جو اس خیال میں موجود ہے کہ ایک ایسی واحد ہستی کے ساتھ رفاقت رکھی جائے جس کو جاننا اور جس سے محبت رکھنا انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے کیونکہ اسی رفاقت کی وجہ سے انسانی روح کے تمام قویٰ بڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں"[1]

اسلام کے عقائد کے برعکس مسیحیت کا یہ عقیدہ ہے۔

"اگرچہ خدا اپنی کائنات سے کہیں بلند و بالا اور برتر ہے تاہم اس کو پسند آیا کہ انسان کی زندگی اور روح کو وہ اس قدر و قیمت دے کہ یہ مشتِ خاک ہیچ اور بے حقیقت ہونے کی بجائے کائنات کی سب سے بیش قیمت شے متصور ہو (متی ۱۶/۲۶ - مرقس ۸/۳۶) خدا نے انسان سے اس قدر محبت رکھی کہ اس نے انسانی نجات کو پورا کرنے کے لئے اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی دریغ نہ کیا (یوحنا ۳/۱۶) خدا اپنے بے حد رحم اور فضل کی وجہ سے گنہگار انسان سے محبت کر کے اس کو توبہ کی جانب مائل کرتا ہے (لوقا ۱۵ باب) تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کر کے خدا کے ساتھ حقیقی رفاقت رکھ سکے۔

[1] Otto, Idea of the Holy

ہندو فلسفہ ایک غیر متشخص طاقت کو مانتا ہے لیکن مسیحیت کے مطابق خدا کے ساتھ ہمارا اس قسم کا تعلق نہیں جو علمِ ریاضی کی کسی صداقت یا فلسفہ کے کسی اصول کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس خدا اور انسان کا باہمی تعلق اس رشتہ کی مانند ہونا چاہئے جو ایک فاعل خود مختار کا دوسرے فاعل خود مختار شخص کے ساتھ ہوتا ہے اور جو ہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں آتا ہے۔ مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ جب کبھی انسان خدا کے ساتھ رفاقت و قربت کا تعلق قائم رکھنے سے قاصر رہتا ہے وہ کسی علمی یا عقلی مغالطہ کا شکار نہیں ہوتا بلکہ وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس طریقۂ کار سے ہم کسی غلط علمی نتیجہ پر نہیں پہنچتے بلکہ ہم خدا کی محبت سے روگردانی کرتے ہیں ❊

اب غبی سے غبی شخص پر بھی یہ ظاہر ہے کہ ہندو مت اور اسلام کے جوابات اور مسیحیت کے جوابات میں بُعد المشرقین ہے۔ مقدم الذکر مذاہب اپنے اپنے نقطۂ خیال سے اس بات کا انکار کرتے ہیں جس پر مسیحی اصول اس قدر اصرار کرتے ہیں۔ دریں حال ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ تینوں جوابات یکساں طور پر صحیح ہیں؟ کوئی صحیح العقل انسان مذکورہ بالا تمام فلسفیانہ نظریوں کو یکساں طور پر درست اور راست نہیں مان سکتا کیونکہ یہ مختلف نظریہ جات نہ صرف مختلف ہیں بلکہ ازروئے منطق متناقض اور متضاد ہیں۔ لیکن وہ مختلف مذاہب کے اصول کے منطقی نتائج ہیں۔ چونکہ یہ نظریہ جات یکساں طور پر درست اور صحیح نہیں ہو سکتے لہٰذا وہ قضایا جن کے یہ نتائج ہیں یعنی مختلف مذاہب کے اصول بھی یکساں طور پر درست اور صحیح نہیں ہو سکتے۔ اگر خدا اور انسان میں

رفاقت ممکن ہو سکتی ہے اور اگر یہ رفاقت مذہب کا حقیقی نصب العین ہے تو یقیناً ہندوازم اور اسلام کے جوابات میں صداقت نہیں اور مسیحیت نے ایسا راستہ کھول دیا ہے جس سے خُدا اور انسان میں رفاقت ہوتی ہے اور یہ قربت روز بروز ترقی کر کے انسانی زندگی کی تقدیس کرتی ہے ٭

(۳)

ادوایت ویدانت کے عقیدہ کے مطابق اس دُنیا کی ہستی حقیقی وجود نہیں رکھتی۔ بقول شخصے۔ ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

چونکہ برہم آتما ہی ایک واحد ہستی ہے جو حقیقی ہے پس دُنیا ایک ہیچ اور بے معنی شے مایا رہ جاتی ہے جس سے کنارہ کشی کرنا ایک لازمی امر ہے کیونکہ صرف تارک الدنیا ہو کر ہم واحد ہستی تک پہنچ سکتے ہیں جس کا نام برہما ہے۔ اسی طرح اسلام کے اللہ کے ارادہ اور رضا کے سامنے انسانی ہستی بے معنی رہ جاتی ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ "خُدا کی ذات کے سوا سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ اسی کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹ جانا ہے" (قصص آیت ۸۸) پس دو مختلف اور متضاد مذاہب ہندومت اور اسلام جن میں بظاہر بُعد المشرقین نظر آتا ہے بالآخر ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور ہم کو ایک ایسی ہستی پر ایمان لانے کی دعوت کرتے ہیں جس کے سامنے کائنات دُنیا اور انسان بے حقیقت اور بے مایہ چیزیں ہیں ٭

اہلِ ہنود کو یہ احساس ہے کہ اُن کا مذہب اور فلسفہ اُن کو اس مشکل میں مبتلا کرتا ہے۔ بالخصوص یہ بات ڈاکٹر رابندرانا تھ ٹیگور جیسے روشن ضمیر انسان اور سر رادھا کرشن جیسے فاضل عالم سے چھپ نہیں سکتی لہٰذا یہ دونوں اصحاب موجودہ علم اور حالات کی روشنی میں ہندو فلسفہ کی نرالی تفسیر کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف ادوائت کی نسبت فرماتے ہیں کہ:۔

"اس کی تعلیم محبت ہے یعنی کائنات اور خدا کے ساتھ یکتائی ہے"۔[1]

سر رادھا کرشن لفظ "مایا" سے مطلب "بھید" لیتے ہیں[2] اور یوں مایا کی تعلیم کو ہندومت اور فلسفہ سے خارج کرتے ہیں لیکن ہندومت سر رادھا کرشن کے نظریۂ زندگی کا اس قدر مخالف ہے کہ جس شے کو سر موصوف ہندومت بتلاتے ہیں وہ ہندومت نہیں ہے کیونکہ مایا کی تعلیم ہندو مذہب کا جزو لاینفک اور ہندو فلسفہ کی روحِ رواں ہے۔ لیکن اگر ان اصلاحی کوششوں کو پرکھا جائے تو ہم پر یہ ظاہر ہو جائیگا کہ ان مصلحین کے فلسفہ میں بھی برہما اور ذاتِ مطلق کا انسان اور کائنات سے کسی قسم کا حقیقی تعلق واسطہ یا رشتہ نہیں۔ ان اصحاب کی نئی شرح کے الفاظ کی سطح کے نیچے وہی قدیم عقیدہ ادوایت و مایا ملتا ہے جس کی تنقید سطور بالا میں کی گئی ہے ٭

اس رشتہ کا اثر اخلاقیات

اگر کائنات اور انسانی زندگی محض مایا سراب اور دھوکا ہے اور حقیقت

[1] Tagore, Letters to a Friend, p. 71
[2] Idealist View of Life, p. 344

سے یکسر مغائر ہے تو خواہ ہم اس نتیجہ پر اودوایت ویدانت کی راہ سے اور خواہ اسلام و قرآن کی راہ سے پہنچیں۔ بہر حال انسان کے فاعلِ خود مختار ہونے کا انکار لازم آتا ہے۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن جی کہتے ہیں:-

"تمام کرم انسان کی سرشت کے گنوں کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں لیکن نادان ہنکار کر کے یہ سمجھتا ہے کہ میں ان کا کرنے والا ہوں" (۳/۲۷) "ہم میں سے کوئی ایک لحظہ بھر کے لئے بھی کوئی شخص بغیر کرم کئے نہیں رہ سکتا کیونکہ پرکرتی کے گن ہر ایک شخص کو خاص کرم کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور وہ لاچار ہو کر ان کو کئے جاتا ہے" (۵/۳) "اے ارجن تم اپنی ذات کے کرم کی وجہ سے مقید ہو۔ جو چیز تم مایا کی وجہ سے نہیں کرنا چاہتے۔ وہ تم کو لاچار ہو کر مجبوراً کرنا پڑے گی۔ خدا تمام موجودات میں موجود ہے۔ اور مایا کی طاقت سے وہ تمام وجودوں کو کمہار کے پہیہ کی طرح گھماتا ہے" (۱۸/۶۰-۶۱)

اودوائت ویدانت کا فلسفہ کرم کے اصول کے ساتھ وابستہ ہے جس کے مطابق انسان کی زندگی کا مستقبل حال پر اور حال ماضی پر اور ماضی اس سے پہلے کی ماضیٔ بعید پر منحصر ہے۔ اندریں حالات یہ بات انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی کہ وہ فاعلِ خود مختار ہو۔ کیونکہ انسان کی زندگی علت و معلول کے سلسلہ کی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے۔ اور اس قید و سلاسل سے مخلصی حاصل کرنا امرِ محال ہے کیونکہ یہ ویدانتی قضایا اور کرم کے اصول کا منطقی نتیجہ ہے پس ہمارے ہندو بھائی تو میت اور اثر آفرینی اور خود تاثری کے ذریعہ اس زنجیر سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں ٭

(۲)

اسلامی تعلیم کے مطابق صرف ایک ہی رضا ہے جو اس کائنات میں درحقیقت کارپرداز ہے اور وہ رضائے الٰہی ہے۔ انسان کا ارادہ کوئی اصلیت و حقیقت نہیں رکھتا۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ مسئلہ تقدیر پر ایمان ہے۔ پس انسان فی الحقیقت فاعلِ خود مختار نہیں رہتا۔ ہندوؤں کے اصول کرم کے مطابق انسان کی زندگی نیچر اور فطرت کے قانون کی غلام ہے جو مقررہ اور غیر مبدل طور پر منظم ہے۔ اسلام میں انسان کی زندگی رضائے الٰہی اور تقدیر کی زبردست زنجیروں میں جکڑی پڑی ہے کیونکہ کائنات میں تقدیر الٰہی کے سوا کوئی دوسری طاقت کام نہیں کرتی۔ اور لفظ اسلام کے معنے "برضائے الٰہی گردن خم کردن" ہے۔ ہم نے اس مضمون پر اپنی کتاب "دینِ فطرت۔ اسلام یا مسیحیت" میں مفصل بحث کی ہے۔ پس ناظرین کی توجہ اس رسالہ کی طرف مبذول کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۳)

چونکہ ہندو مت اور اسلام میں انسانی زندگی اصلی معنوں میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی ہے لہذا تمام اخلاقی مساعی اور کوششیں جو انسان اپنی روحانی ترقی کو حاصل کرنے کے لئے بدل و جان کرتا ہے سراسر بے معنی اور بے حقیقت ہو جاتی ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں جو از سر تا پا محض دھوکا فریب اور مایا ہے یا جس میں انسانی زندگی ایک بے بہا شے تصور کی جاتی ہے اخلاقی کشمکش اور روحانی جدوجہد ایک بناوٹی اور مصنوعی جنگ سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتی کیونکہ ان کے قضایا

کے مطابق حقیقت میں کوئی عمل واقع نہیں ہوتا اور جو واقع ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ محض نظر آفرینی اور مایا کا نتیجہ ہے۔ ہماری حقیقت خود ایک سایہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے پس جس اخلاقی نصب العین تصور یا مطمح نظر کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ بھی سایہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتا۔

پروفیسر ٹیلر سچ کہتا ہے کہ:-

"جب ہم کائنات کے نظریہ سے فطرت کو یا فوق الفطرت کو خارج کر دیتے ہیں تو ہماری اخلاقی زندگی کا ستیاناس ہو جاتا ہے"۔

ہماری اخلاقی زندگی درحقیقت ہماری تمام اخلاقی کوششوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی پہلی منزل فطرت ہے اور آخری منزل خدا ہے۔ ہم زندہ خدا کو اپنی زندگی سے الگ کرکے یا اس کو خارج کرکے یا حقیقی عالم شہود کو دھوکا قرار دے کر اخلاقی کوشش اور روحانی ترقی نہیں کر سکتے۔

(۴)

ہندو فلسفہ میں بدی جہالت کی مترادف ہے اور نیکی گیان کی مترادف ہے۔ پس بدی روح کا مرض نہیں بلکہ محض مایا ہے جو گیان کے ذریعہ دور ہو سکتی ہے چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن جی کہتے ہیں:-

سب سنسار تینوں گنوں سے بنی ہوئی چیزوں کی وجہ سے مجھ کو نہیں جان سکتے۔ اس مایا کو جو گنوں کی وجہ سے ہے جس کا پار دشوار ہے لیکن صرف وہی جو اس کے پار ہو جاتے ہیں میرے پاس آ سکتے ہیں لیکن بدکار وہ

Taylor, the Faith of a Moralist, vol. i, p. 124

ہیں جن کی بدھی ماری جاتی ہے۔ وہ میرے پاس نہیں آتے۔ کیونکہ مایا کا اثر ان کی عقلوں پر ہوتا ہے اور وہ اسور ہوتے ہیں۔ (۷ : ۱۴-۱۵)

"میرے نور سے جہل اگیان کی تاریکی دور ہو جاتی ہے"۔ (۱۰ : ۱۱)

ویدانت کے نزدیک بدی اور جہالت ایک ہی شے ہے۔ اور دونوں بے حقیقت ہیں۔ اسلام میں بھی بدی اور نیکی دونوں کا وجود اللہ کے قادر ارادہ کی وجہ سے ہے۔ "اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے"۔ پس ان دونوں عقیدوں کے مطابق بدی ایسی دشمن نہیں جس کے ساتھ جنگ کرنا اور جس کو مغلوب کرنا انسان کا فرض اولین ہو۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کا اثر ہماری روحانی جدوجہد اور کشمکش پر پڑتا ہے۔ کیونکہ انسان کا یہ اولین فرض نہیں رہتا کہ بدی کی طاقتوں کے ساتھ حتی الوسع جنگ کرے۔

(۵)

علاوہ ازیں اسلامی اور ہندو عقیدوں کے مطابق بدی کا وجود اس دنیا سے نہیں مٹ سکتا۔ کیونکہ وہ ان عقاید کے مطابق لازمی شے ہے چونکہ اسلام کا خدا نیکی اور بدی دونوں کا خالق ہے لہذا بدی کے وجود کا دنیا سے اٹھ جانا ایک امر موہوم ہے۔ ہمہ اوستی عقیدہ کے مطابق نیکی اور بدی کا امتیاز کرنا جہالت اور حماقت پر دال ہے کیونکہ ذات مطلق کا وجود نیکی اور بدی دونوں میں ظہور پکڑتا ہے۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن کہتے ہیں "میں ہی دغابازوں کا مکر ہوں اور نیکوں کی نیکی ہوں" (۱۰ : ۳۶) اور سوامی ویویکانند کہتے ہیں "گناہ محض ایک دھوکا اور مایا ہے۔ جس کی درحقیقت کوئی ہستی نہیں۔ کسی انسان کو گنہگار کہنا سب سے

بڑا گناہ ہے" ؎

سمجھتا ہے تو داغ کو رند زاہد — مگر رند اس کو ولی جانتے ہیں

دریں صورتِ حالات اخلاقی کشمکش اور رُوحانی جنگ بے معنی الفاظ رہ جاتے ہیں اور بدی کی طاقتوں سے جنگ کرکے اُن پر غالب آنا ایک فضول امر ہو جاتا ہے ÷

(۶)

مندرجہ بالا نظریہ جات کے برعکس مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ بدی مایا اور دھوکا نہیں بلکہ ایک زبردست حقیقت ہے جو ہم کو انسانی تعلقات کے ہر گوشہ میں ملتی ہے (روم پہلا باب) ہم کو حکم ہے کہ "بدی سے نفرت رکھو نیکی سے لپٹے رہو" (روم ۱۲/۹) "نیکی کے ذریعہ سے بدی پر غالب آؤ" (روم ۱۲/۲۱) "کیونکہ جو بدی کرتا ہے وہ نُور سے دُشمنی رکھتا ہے" (۱یو ۳/۱۴) پس بدی کی طاقتوں سے جنگ کرنا ہمارا مقدم فرض ہے (افسی ۶/۱۲ وغیرہ) مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ بنی نوع انسان کی حالت کو سدھارنا اور خلقِ خدا کی خدمت کرنا انسان کی سعادتِ دارین کا باعث ہے (متی ۲۵باب) ہندو مذہب اور فلسفہ جو دُنیا اور زمان و مکان کے تعلقات کو مایا قرار دیتا ہے وہ کس طرح اس قابل ہو سکتا ہے کہ دُنیا کی حالت کو سدھار سکے؟ دریں صورت کوئی صحیح العقل شخص ان دونوں اصولوں کو کس طرح یکساں قبول کرکے دونوں کو برابر طور پر صحیح مان سکتا ہے؟ مسیحیت ہم کو کہتی ہے کہ ہمارا فرض ہے کہ زمان و مکان کی قیود کے اندر خُدا کی بادشاہت کی آمد کے لئے راہ تیار کریں۔ یہ شرف مسیحیت ہی کو حاصل ہے کہ وہ تمام انسانی اعمال و افضال اور تمام دُنیاوی تعلقات مثلاً مرد و زن کے تعلقات

والدین اور بچوّں کے تعلقات حاکم و محکوم کے تعلقات وغیرہ کو ابدی زندگی سے متعلق کرتی ہے اور ہم کو تعلیم دیتی ہے کہ ان تعلقات کے ذریعہ ابدی زندگی اِسی زندگی میں ہم کو ملتی ہے کیونکہ دُنیاوی تعلقات روحانی زندگی کے حقیقی پہلو ہیں چنانچہ مقدس یُوحنا کہتا ہے :-

"جو کوئی راستبازی کے کام نہیں کرتا وہ خُدا کی طرف سے نہیں اور وہ بھی نہیں جو اپنے بھائی سے محبت نہیں رکھتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ہم بھائیوں سے محبت رکھتے ہیں۔ جو محبت نہیں رکھتا وہ موت کی حالت میں رہتا ہے" (۱یوحنا ۳باب)

(۷)

چُونکہ ہندُومت اور فلسفہ میں اخلاقی مساعی جمیلہ کے لئے جگہ نہیں اور اسلام کی تعلیم رُوحانی جدوجہد کی ممد و معاون نہیں۔ لہٰذا یہ مذاہب ہندوستان کی حالت کو سدھار نہ سکے۔ سر رادھا کرشن اور سر محمد اقبال (مرحوم) جیسے فلاسفر بہتیرا زور مار چکے لیکن ناکام رہے۔ دورِ حاضر میں ہندوستان اور غیر ممالک میں ہندومت اور فلسفہ پر کسی شخص کی کتابیں اس قدر مقبولِ عام نہیں ہوئیں جتنی سر رادھا کرشن کی۔ آپ کی انگریزی کُتب کا ترجمہ یورپ کی دیگر زبانوں میں بھی ہو گیا ہے۔ ان کتابوں میں آپ نے اپنی خُداداد قابلیّت کو کام میں لا کر از حد کوشش کی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہندومت اور فلسفہ میں اخلاقی جدوجہد اور روحانی کشمکش کے لئے جگہ نکل آئے۔ لیکن آپ باوجود اس قدر لیاقت کے ناکام رہے کیونکہ جس مذہب اور فلسفہ کے آپ نام لیوا ہیں۔ اُس میں از روئے عقل اخلاقی جدوجہد کے لئے جگہ ہے ہی نہیں۔ پس جائے تعجب نہیں کہ ہندو

مذہب ہندوستان کی حالت کو سدھار نہیں سکا۔ اس کے فلسفہ کے اصول نے ہندوستان پر افیون کا سا اثر ڈال رکھا ہے۔ ہندوستان کی گذشتہ ہزاروں سالوں کی تاریخ زبانِ حال سے پکار پکار کر اس مذہب اور فلسفہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہی ہے۔ ہمارے مُلک کے کروڑوں اچھوت لاکھوں ہندو بیوائیں اور دیگر مظلوم اس مذہب اور فلسفہ کی تہید ستی کے زندہ گواہ ہیں۔ ہندوستان کے ملک اور قوم کی حالت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی جب تک ہندومت اور فلسفہ اپنے کرم اور تناسخ کے عقیدوں کو ترک نہ کریگا اور اپنی موجودہ دھندلی مبہم اور غیر معین شکل بدل کر کوئی دُوسری شکل اختیار نہ کریگا۔ ہندوستان کی موجودہ صورتِ حالات مثلاً اچھوت کو اُٹھانے وغیرہ میں اصلاح ناممکن ہے تاوقتیکہ ہندومت اپنے اصول کو ترک نہ کرے۔ ہندوستان کے سوشل ریفارمر اور مصلحین ہمیشہ یہی شکایت کرتے رہے کہ ہندومت اور فلسفہ کے اصول ان کی اصلاحی کوششوں میں مداخلت کرتے ہیں۔ ذات پات کی امتیاز قوم کی شیرازہ بندی نہیں کرنے دیتی۔ کرم اور تناسخ کے اصول ہندوستان کی برائیوں مثلاً عورتوں کی پستی۔ ہندو بیواؤں کی قابلِ رحم حالت مظلوموں اور اچھوتوں وغیرہ کی ذمہ دار ہیں۔ یہ درست ہے کہ دَورِ حاضر کے ہندو مسیحی اصولِ محبت اور مسیحی مبلغین کی خدمت اور ایثارِ نفسی سے متاثر ہو کر اُن کی حالت کو سدھارنے کے خواہشمند ہیں لیکن ہندو نظریۂ کائنات کے طوق و سلاسل کے ثقیل وزن کی وجہ سے ان کی کوششیں بے سُود ثابت ہو رہی ہیں کیونکہ ہندو فلسفہ ان کی مساعیٔ جمیلہ میں ممد و معاون نہیں ہے۔ حقوق العباد دراصل خُدا کے تصوّر پر مبنی ہیں۔ ان مصلحین

کو ایک ایسے الٰہی تصوّر کی ضرورت ہے جو اُن کو اصلاح کی جانب تحریک و ترغیب دے سکے۔ لیکن اس قسم کا الٰہی تصوّر ہندو فلسفہ اور ہندومت میں کالعدم اور فی المعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ ایک بے حرکت اور ساکن اور جامد ذاتِ مُطلق کس طرح ان مصلحین کو رحم و محبت ایثار و خدمت کی طرف راغب کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہندومت میں بہترین شخص وہ شمار کیا جاتا ہے جو ہر قسم کے جذبات سے خالی ہو چنانچہ بھگوت گیتا میں کرشن کہتے ہیں":-

"سچا سنیاسی وہ ہے جو محبت اور نفرت دونوں سے خالی ہے۔ ایسا شخص نجات حاصل کرتا ہے" (۵/۳) "وہی سنیاسی نروان حاصل کرتا ہے (یعنی اسی شخص کی ذات ذاتِ مطلق میں فنا ہو جاتی ہے) جو عرفان حاصل کر کے خواہش اور جذبات سے خالی ہو جاتا ہے" (۵/۲۶) "جو اپنے حواس اور من اور بُدھی کو قابو میں رکھ کر مکتی کا طالب ہوتا ہے اور ہمیشہ کے لئے خواہش خوف اور جذبہ کو مار ڈالتا ہے وہی مکتی پاتا ہے" (۵/۲۸) "جو ودوان ہوتے ہیں وہ نہ کسی زندہ شخص کے لئے غم کھاتے ہیں اور نہ کسی مُردے پر افسوس کرتے ہیں" (۲/۱۱) "کامل ودوان وہ ہے جو نہ خوشی کے وقت خوشنودی کرتا ہے اور نہ دُکھ میں پریشان ہوتا ہے۔ وہ خوف اور غُصّہ اور محبت کے جذبات سے خالی ہوتا ہے وہ ہمہ امر میں بغیر کسی شے سے محبت کئے زندگی بسر کرتا ہے وہ نہ کسی شے کو پسند کرتا ہے اور نہ ناپسند کرتا ہے" (۲/۵۶) "اس شخص کو مکتی پراپت ہوتی ہے جو بغیر کسی جذبہ کے اس کرم کو جو اس کا دھرم ہے کرتا ہے" (۱۸/۲۳) "وہ جو نہ افسوس کرتا ہے نہ خواہش کرتا ہے نہ شاد ہوتا ہے نہ ناشاد ہوتا ہے۔ وہ جو نیکی اور بدی دونوں کو چھوڑ دیتا ہے ایسا

شخص میرا پیارا بھگت ہے" (۱۲)

لیکن زندگی آرزو کا نام ہے۔ ہندو فلسفہ کا تعلق صرف نروان کے ساتھ ہے۔ موجودہ زندگی اور اس کے لواحق سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔ لیکن ؎

خلوت کی گھڑی گذری جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کی ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر

ہندو عقائد کی وجہ سے مسٹر ڈیسائی جیسا سیاست دان کہتا ہے کہ "مذہب کا تعلق خدا اور انسان کے ساتھ ہے۔ اس کا واسطہ انسانی تعلقات کے ساتھ نہیں ہوتا" یہ فقرہ ظاہر کرتا ہے کہ ہندو نظریہ کی وجہ سے مسٹر ڈیسائی اس بات سے (جس کو مسیحی کلیسیا کا بچہ بچہ جانتا ہے) ناواقف ہیں کہ مذہب نج کا معاملہ نہیں اور اس کا تعلق نہ صرف خدا اور انسان کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ اس رشتہ کا اصلی ظہور تمدنی معاشرتی اقتصادی سیاسی اور دیگر انسانی تعلقات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انجیل جلیل میں وارد ہوا ہے :-

"اگر کوئی کہے کہ میں خدا سے محبت رکھتا ہوں اور وہ اپنے بھائی سے عداوت رکھے تو جھوٹا ہے۔ ہم کو مسیح کی طرف سے یہ حکم ملا ہے کہ جو کوئی خدا سے محبت رکھتا ہے وہ اپنے بھائی سے بھی محبت رکھے" (۱-یوحنا ۲۰/۴ وغیرہ) "ہمارے خدا اور باپ کے نزدیک خالص اور بے عیب دینداری یہ ہے کہ یتیموں اور بیوہ عورتوں کی مصیبت کے وقت خبر لیں اور اپنے آپ کو دنیا سے بے داغ رکھیں" (یعقوب ۲۷/۱) "جو مجھ کو اے خداوند اے خداوند کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک آسمان

کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگا۔ مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے (متی ۲۱/۷)

جب مسیح اپنے جلال میں آکر قوموں کی عدالت کریگا تو وہ بعض کو کہے گا :-

"آؤ میرے باپ کے مبارک لوگو۔ جو بادشاہت بنائے عالم سے تمہارے لئے تیار کی گئی ہے۔ اس کو میراث میں لو کیونکہ میں بھوکا تھا۔ تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ میں پردیسی تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا تھا۔ تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ میں پردیسی تھا تم نے مجھے گھر میں اتارا۔ میں بیمار تھا تم نے میری خبر لی۔ قید میں تھا تم میرے پاس آئے۔ تب راستباز جواب میں کہینگے "اے خداوند ہم نے کب تجھ کو بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا یا پیاسا دیکھ کر پانی پلایا۔ ہم نے کب تجھے پردیسی دیکھ کر گھر میں اتارا یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا۔ ہم کب تجھے بیمار یا قید میں دیکھ کر تیرے پاس آئے؟ تب اُن کو یہ جواب ملے گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں چونکہ تم نے غربا سے جو میرے سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے ہیں یہ کیا اس لئے تم نے یہ سلوک میرے ہی ساتھ کیا"۔ (متی ۲۵/۳۱-۴۵)

مذکورہ بالا چند اقتباسات سے ظاہر ہے کہ ہندوازم کے برعکس مسیحی اصول کے مطابق مذہب اُس رشتہ سے مترادف نہیں جو خدا اور انسان کے درمیان ہے۔ بلکہ مذہب اس رشتہ کو اُن دنیاوی تعلقات میں دیکھنا چاہتا ہے جو مختلف انسانوں میں موجود ہیں۔ تمام ادیانِ عالم میں مسیحیت ہی ایک واحد مذہب ہے جو ذاتِ الٰہی اور انسانی تعلقات

کے تصورات اس قسم کے پیش کرتا ہے جو مسیحیوں کو اس بات پر مجبور کر دیتے ہیں کہ مظلوموں زیردستوں لاچاروں اور مصیبت زدوں (۱) کی مدد کریں کیونکہ اُن کا خدا محبت کا زندہ خدا ہے۔ مسیحیت ہندو مت کی طرح کوئی فلسفہ نہیں ہے بلکہ وہ انجیل یعنی خوشی کی خبر ہے۔ اور ہر کس و ناکس کے لئے بشارت کا پیغام ہے ÷

سب سے بڑا معیار جس سے ہم مذاہبِ عالم کو جانچ سکتے ہیں یہ ہے کہ ان کی نشو و نما اور ترقی اور تاریخ نے دُنیا پر کیا اثر ڈالا۔ کسی زندہ مذہب کے اصول کے عملی پہلوؤں کی پڑتال اس سے ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنے مقلدین میں کس قسم کی زندگی جاری کی۔ کیونکہ ایمان کا نتیجہ عمل ہے اور مذہب کی علتِ غائی یہ ہے کہ دُنیا میں ایک ایسی طبیعت طینت کیرکٹر اور خصلت نمودار ہو جائے جس کی وجہ سے بنی نوعِ انسان سے ایسے اعمال سرزد ہوں جن سے دُنیا کی کایا پلٹ جائے۔ کیا ہندو مت اور فلسفہ سے یہ کام ہو سکا؟ تاریخ ہند اس بات کا بیانگِ دہل انکار کرتی ہے۔ ہم نے اپنی کتاب دینِ فطرت میں ثابت کیا ہے کہ اسلام اس مبارک کام کے کرنے سے قاصر رہا ہے۔ کامیابی کا سہرا صرف مسیحیت کے سر پر ہے۔ پھر کوئی کس منہ سے کہہ سکتا ہے کہ تمام مذاہب برابر اور یکساں ہیں؟

باب سوم

مذہبی رواداری اور قوم کی شیرازہ بندی

ہندوستان کے مذاہب اور فرقہ وارانہ ذہنیت

گذشتہ ابواب میں ہم نے دیکھا تھا کہ اہل ہنود اپنے مذہب کے غیر معین اصول اور فلسفہ کی وجہ سے اس بات کے قائل ہیں کہ تمام مذاہب یکساں طور پر اپنی اپنی جگہ برحق ہیں اور کسی ایک مذہب کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ دورِ حاضرہ میں قوم کی شیرازہ بندی کو مدنظر رکھ کر ہمارے لیڈر ہم کو یہی سبق سکھانا چاہتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں طور پر برحق ہیں اور تمام مذاہب کے بانی یکساں طور پر قابلِ تعظیم ہستیاں ہیں۔ اور مذہبی رواداری کا یہ سبق اس غرض سے سکھایا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں ملتوں اور جماعتوں کی شیرازہ بندی ہو جائے اور ہندوستان ایک قوم بن جائے ÷

(۱)

یہ صورتِ حالات زمانۂ حال کے سیاسی واقعات کی وجہ سے رُونما ہوئی ہے۔ انگلستان ہندوستان پر حکمران ہے۔ اور اس نے ہندوستانیوں کو ان کے فرقوں کے تناسب کے لحاظ سے حقوق دیئے ہیں۔ پس اس کمیونل

سے ہندی سیاسیات نے فرقہ دارانہ
اوآرڈیا فرقہ دارانہ تناسب کی وجہ سے ہندی سیاسیات نے فرقہ دارانہ صورت اختیار کر لی ہے۔ اس اوآرڈ کی رُو سے صرف ایک مذہب کی بناء پر ہی کوئی جماعت اپنے دنیاوی اقتصادی اور سیاسی حقوق کی حفاظت کر سکتی ہے پس عہدِ حاضر میں ہندوستان فرقہ دارانہ جنگوں کی جولان گاہ بنا ہُوا ہے۔ وہ ملک جس کو کبھی جنّت نشاں کہا جاتا تھا ان جنگوں اور لڑائیوں کی وجہ سے دوزخ کا نمونہ بنا ہُوا ہے۔ ہندو اور مسلمان سکھ اور عیسائی ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جب دلوں میں شک ہوتا ہے تو باہمی محبّت رُخصت ہو جاتی ہے اور صلح اور آشتی کی بجائے دُشمنی اور عداوت کا دَور دورہ ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک اور قوم کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو نفاق کی آگ کو بُجھانے کی بجائے اس کو تیز کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کو اپنے ذاتی اغراض اور ملی مقاصد پر قومی مفاد کو قربان کرنے میں ذرا باک نہیں ہے۔ یہ دُشمنانِ دین مذہب کی آڑ لے کر خلق اللہ سے ایسی حرکتیں کرواتے ہیں جو اُن کے مذہب کی بدنامی کا باعث ہوتی ہیں۔ کیونکہ درحقیقت ان کو خُدا اور مذہب کا پاس نہیں ہوتا۔ بالفاظ انجیل جلیل

"اُن کا خُدا اُن کا پیٹ ہے۔ وہ دُنیا کی چیزوں کے خیال میں رہتے ہیں وہ خُدا کی نسبت عیش و عشرت کو زیادہ دوست رکھتے ہیں اور دینداری کی وضع رکھ کر چکنی چپڑی باتوں سے سادہ لوحوں کو بہکاتے ہیں"

(روم ۱۶/۱۸ - فلپی ۳/۱۹ - ۲ تمطا ۳/۴)

جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف مذاہب کے پیرو بمصداق ع

ایمان برائے طاعت و مذہب برائے جنگ

فرقہ دارانہ فسادات کو برپا کرنے کی تاڑ میں رہتے ہیں اور اپنے اپنے فرقہ کے لئے حقوق حاصل کرنے کی خاطر باہمی پرخاش اور جدل کے موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور شب و روز آتشِ عداوت کو تیز کرنے میں مشغول رہتے ہیں ٭

کولٹن (Colton) نے کسی جگہ ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا ہے کہ :-

"لوگ مذہب کی خاطر دھواں دھار تقریریں کرتے اور بے شمار کتابیں لکھتے ہیں۔ وہ اُس کی خاطر جنگ و جدل کرتے ہیں۔ لیکن اس کے مطابق زندگیاں بسر نہیں کرتے"۔

اخبار سٹیٹسمین کے ایڈیٹر مسٹر آرتھر مور درست کہتے ہیں کہ :-

ہندوستان کے مذہبی اختلافات کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر مذہب کا احساس موجود نہیں ہے۔ ہم خُدا کی خاطر ایک دوسرے سے لڑتے ہیں کیونکہ ہم میں خُدا کا علم موجود نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالق اور اس کی خلقت کے درمیان جو دروازہ ہے وہ بند ہو گیا ہے۔ ہندوستان اور دُنیا کو ایک نئے پیشوا اور ہادی کی ضرورت ہے جس نے خُدا کو دیکھا ہے۔ تاکہ وہ نوعِ انسانی کو طمع اور لالچ سے نجات دے اور اس کو ترقی کی راہ پر چلائے" (ٹریبون ۲۶ فروری ۱۹۴۰ء)

(۲)

ہر ذوقِ سلیم رکھنے والے شخص کی طبیعت آئے دن کی مذہبی جنگوں اور فرقہ دارانہ لڑائیوں کی وجہ سے قدرتاً متنفر ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ سلیم طبائع پر مذہب کو وہ اقتدار حاصل نہیں رہا جو اس

صدی کے آغاز میں تھا۔ بالخصوص صحیح مذاق کے نوجوانوں کا طبقہ مذہب کے نام سے بیزار نظر آتا ہے۔ جرمن فلاسفر شلائر میخر Sache ier Macher) نے خوب کہا ہے کہ :۔

"بالعموم ایک پشت اپنے سے پہلی پشت کی غلطیوں کو ایک اور غلطی کرنے سے درست کرتی ہے"۔

گذشتہ پشت مذہب کی اس قدر دلدادہ تھی کہ ہر وقت دُعا نماز گیان دھیان میں مصروف دُنیاوی ترقی سے بے خبر تھی۔ موجودہ پشت نے اس غفلت شعاری کو یوں درست کیا ہے کہ مذہب اور دین اور خُدا کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اس معاملہ میں نوجوان طبقہ مُلک رُوس کی پیروی کر کے مذہب کو زندگی کے ہر شعبہ سے خارج کرنے پر تُلا ہُوا ہے۔ اس طبقہ کا اگر کوئی مذہب ہے تو وہ قوم پرستی اور وطن پرستی ہے اور یہ مذہب ایک جارحانہ صُورت اختیار کر رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ ان کی نظر میں مذہبی اصُول کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور بالفاظِ مسٹر گاندھی

"سیاسیات کے اژدہا نے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے"۔

ہندوستانی قوم کا اُس دن خاتمہ سمجھو جس روز یہ خُدا اور مذہب کے لئے اِس مُلک میں جگہ نہ رہی۔ ہمارے نوجوان خُدا کو بھُول گئے ہیں۔ لیکن انھوں نے پرستش کرنی نہیں چھوڑی کیونکہ پرستش انسانی فطرت کی طبیعت میں داخل ہے۔ لہٰذا وہ سچے خُدا کی بجائے جھُوٹے معبودوں کی پرستش کر رہے ہیں۔ اور یہ جھوٹے معبُود اُن کے خودساختہ نظریے ہیں۔ بُت پرست کا معبُود اس کا خودساختہ بُت ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے نوجوان پتھر، چاندی یا سونے وغیرہ کے بتوں سے بیزار ہو کر

ہاتھ کے بنائے ہوئے بُتوں کی بجائے دماغوں کے بنائے ہوئے بُتوں کے آگے سربسجود ہیں۔ پس قومیت اور وطن پرستی نے مذہب اور خُدا پرستی کی جگہ غصب کر لی ہے اور قوم کے تصوّر نے ہندوستانیوں کے دلوں پر وہ اقتدار حاصل کر لیا ہے جو کسی زمانہ میں خُدا کے تصور کو حاصل تھا۔ آج کل جس کو دیکھو وہی قوم اور وطن پر فدا ہے۔ قومیت یا وطنیت بجائے خود ایک مستقل مذہب ہو گیا ہے۔ چنانچہ مشہور بنگالی لیڈر آربندو گھوش کہتا ہے کہ :۔

"قومیت ایک ایسا مذہب ہے جو خُدا کی طرف سے ہے۔ قومیت مر نہیں سکتی کیونکہ خُدا مر نہیں سکتا۔ خُدا جیل خانہ میں بھیجا نہیں جا سکتا"۔

یُوں قومیت کے زہریلے جراثیم ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کر گئے ہیں خواہ وہ شعبہ اقتصادیات سے متعلق ہو یا علم ادب سے خواہ وہ سیاسیات سے اور خواہ مذہب سے متعلق ہو۔ غرضیکہ تمام امورِ زندگی کو قومیت کی کسوٹی اور معیار سے پرکھا جاتا ہے۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ :۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے جس طرح میں جادو ٹونے پر یقین نہیں رکھتا۔ اسی طرح مَیں مذہب کو بھی نہیں مانتا اور نہ اُس میں کوئی فائدہ دیکھ سکتا ہُوں"۔

اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے ہمارے نوجوان آمنّا وصدقنا پکار اُٹھتے ہیں۔ کیونکہ قومیّت اور وطنیت کا جذبہ اُن میں جوش زن ہے۔ ہمارے ان نوجوانوں کو سکولوں اور کالجوں میں دینی تعلیم نہیں ملتی جس کا

نتیجہ یہ ہوگیا ہے کہ ان کی مذہبی حس میں حرکت نہیں رہی ۔ اور وہ خدا اور مذہب کی اہمیت کے منکر ہو گئے ہیں ۔ اس کا اثر اُن کی خُو او خصلت پر پڑگیا ہے اور اب دورِ حاضر میں جس کو دیکھو وہی روتا ہے کہ نئی پود میں ضبط اور ذمہ داری کا احساس نہیں رہا !!

ہر محبِ وطن کا نصب العین یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح قوم کی شیرازہ بندی کی جائے ۔ چونکہ بظاہر مذہب اس شیرازہ بندی کی راہ میں ہے لہذا دو قسم کے خیالات پیدا ہو گئے ہیں ۔ پہلی قسم کے لوگ مذہب سے اس قدر متنفر ہو گئے ہیں کہ وہ مذہب کا قلع قمع کر دینا چاہتے ہیں ۔ وہ رُوس کی نظیر پیش کر کے کہتے ہیں کہ جب سے روس مذہب کی قید سے آزاد ہُوا ہے ۔ وہ ترقی کی دَوڑ میں بیش از پیش ہے اور ہندوستان بھی کبھی ترقی نہیں کریگا جب تک خدا اور مذہب ملک بدر نہ کر دیا جائیگا ۔ گویا خُدا کو ہندوستان سے نکال کر ہندوستانی قوم ترقی کر سکتی ہے !

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو اس حد تک جانا نہیں چاہتے پس یہ قومی لیڈر فرقہ وارانہ فسادات کو مٹانے کے لئے کہتے ہیں کہ ان فسادات کی اصل جڑ فرقہ وارانہ تناسب ہے ۔ جو برطانیہ نے آمرانہ حیثیت سے کیا ہے ۔ جب کسی فرقہ کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے تو اس تناسب کی وجہ سے اس کو زیادہ اقتصادی اور سیاسی حقوق مل جاتے ہیں ۔ پس کسی مذہب کو یہ اجازت نہیں ہونی چاہئے ۔ کہ وہ اپنی جماعت کو تبلیغ و تحریص کے ذریعہ بڑھا سکے ۔ یہ صُورت تب پیدا ہو سکتی ہے جب ہم یہ مان لیں کہ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر فوقیت حاصل

نہیں اور یہ اصول تب ہی مانا جا سکتا ہے جب ہم اس پر اتفاق کر لیں کہ تمام مذاہب برابر ہیں اور کسی ایک مذہب کے اصول دوسرے سے اعلےٰ یا ادنےٰ نہیں پس اس بات کا ہر ممکن طور پر پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مذاہب کی تمیز و تفریق کو یکسر بھول جانا چاہئے ۔ تاکہ ہندوستانی قوم کی شیرازہ بندی ہو سکے اور ہمارا نصب العین یہ ہو کہ تمام ہندوستانی بلا تمیز رنگ ۔ نسل ۔ ذات ۔ فرقہ اور مذہب ایک قوم بن جائیں اور اس مقصد کو پُورا کرنے کے لئے تمام مذاہب کو چاہئے کہ اس بات پر متفق ہو جائیں کہ تمام مذاہب یکساں طور پر حق ہیں اور چُونکہ وہ برابر ہیں لہذا کسی ایک مذہب کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ۔ پس کسی مذہب کا معتقد اس بات کا مجاز نہیں ہوگا کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو یہ دعوت دے کہ تم اپنا مذہب ترک کر کے میرا مذہب قبُول کر لو اور نہ کسی شخص کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کر کے دوسروں کو اس کا حلقہ بگوش کرے ۔ اور اگر کوئی شخص اس قسم کی جراُت کرے گا تو وہ قوم کا غدار تصوّر کیا جائیگا اور ملک کے قوانین کی رُو سے مجرم گردانا جائے گا ۔

(۲)

لیکن اگر اس ایک حقیقت پر کُل مذاہب کا اتفاق ہے کہ ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

تو یہ امر ظاہر ہے کہ مذہب بذاتِ خُود ہندوستانی قومیت کی شیرازہ بندی کی راہ میں حائل نہیں ہے ۔ بلکہ فرقہ وارانہ فسادات کی اصلی جڑ فرقہ وارانہ تناسب ہے یہ ایک طوق ہے جو برطانیہ نے ملک ہندوستان

کے گلے میں ڈال دیا ہے۔ پس لازم تو یہ ہے کہ اس فرقہ وارانہ تناسب کو مٹانے کی کوشش کی جائے تاکہ کسی مذہب و فرقہ کی تعداد کے بڑھنے یا کم ہونے سے اس کے اقتصادی اور سیاسی اقتدار میں سر مُو فرق نہ آئے۔ لیکن یہاں اُلٹی گنگا بہ رہی ہے۔ اس کی بجائے کہ کانگریس اس تناسب کو نابود کرنے کی کوشش کرتی سارا زور اس بات پر لگایا جاتا ہے کہ مذاہب کی تبلیغی مساعی کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ اور ہم کو اُلٹی منطق یہ پڑھائی جاتی ہے کہ تمام مذاہب برابر ہیں ✤

(۴)

ان قومی لیڈروں کے زعم میں مذہب مُلکی اور قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہے اور مذہب کے وجود کی وجہ ہی سے ہمارے مُلک میں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ پس یہ لیڈر قومی تنظیم اور فرقہ وارانہ جنگوں کو مٹانے کی خاطر ہم کو یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ مذہب کا تعلق خُدا سے ہے اور اس کو سیاسیات میں دخل دینا نہیں چاہیئے۔ چنانچہ گذشتہ باب میں ہم مسٹر دیسائی کا قول نقل کر کے اس کی بطالت کو واضح بھی کر چکے ہیں۔ یہ بات غلط ہے کہ مذہب کا دُنیاوی تعلقات اور معاشرتی تمدنی اقتصادی اور سیاسی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ اصحاب مذہب کی غرض و غایت سے ناواقف ہیں اگر مذہب کا انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں تو دیندار شخص وہ ہوگا جو تارک الدُنیا ہو جائے اور بیوی کو طلاق بچّوں کو عاق اور سوسائٹی کو چھوڑ چھاڑ الگ ہو جائے۔ حق تو یہ ہے کہ جب تک مذہب دُنیاوی تعلقات کے ساتھ واسطہ نہ رکھے گا وہ اپنی علتِ غائی کو فوت کر دیگا۔ قومیت و

وطنیت کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مذہب انسان کا نجی معاملہ ہے۔ اس لئے وہ انسان کی سیاسی معاشرتی اور اقتصادی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ لیکن مذہب محض ایک اخلاقی نصب العین ہی نہیں بلکہ وہ مکمل دستورِ حیات ہونا چاہیئے۔ مذہب کا کام بنی آدم کو صرف عقائد مذہبی کی ہی تلقین کرنا نہیں۔ بلکہ اس کے اصول نظامِ معاشرت پر بھی حاوی ہوتے ہیں۔ لہذا انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے ہمہ گیر اقتدار سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ کوئی مذہبی شخص اپنی زندگی کو دو یا اس سے زیادہ طبقوں میں منقسم نہیں کر سکتا ایسا کہ ایک طبقہ مذہب کے زیر اثر ہو اور دیگر طبقے کسی دوسرے دستورالعمل کے ماتحت ہوں۔ بالخصوص مسیحیت نے زندگی کو ایک ناقابل تقسیم وحدت قرار دے دیا ہوا ہے۔ خُدا کی عبادت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ انسان خلقِ خُدا کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو۔ بالخصوص مسیحیت کے اصُول ہی ایسے ہیں کہ جب تک ان کا اطلاق انسانی تعلقات پر نہ کیا جائے وہ بے معنی رہینگے۔ اب کون شخص ایسا دیدہ دلیر ہوگا جو یہ دعوے کرے کہ الہٰی ابوت اور انسانی اُخوت و مساوات کے اصُول کا اطلاق ہندوستان کے تمدّنی اقتصادی اور سیاسی معاملات پر نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر ان اصُولوں کا اطلاق دُنیاوی تعلقات پر کیا جائے تو ہندوستان میں ایک سُنہری دور شروع ہو جائیگا۔ اور مسیحیت کا تو دعوےٰ ہی یہ ہے کہ اس کے اصُول پر عمل کرنے سے دُنیا کی کایا پلٹ جاتی ہے اور وہ از سرِ نو ایک نئی دُنیا بن سکتی ہے۔ اس کی صداقت کا معیار ہی یہ رہا ہے کہ اس نے ہر زمانہ قوم اور مُلک کی کایا پلٹ دی ہے اور تاریخ عالم اس دعوی کی صداقت پر اپنی مہر ثبت کرتی ہے ✤

قومیت اور رواداری

ہمارے قومی اور سیاسی لیڈر رواداری کا سبق ہم کو سکھاتے ہیں تاکہ موجودہ فرقہ وارانہ فضا صاف ہوجائے۔ وہ مختلف مذاہب کے پیشواؤں کو کہتے ہیں کہ تم ایمانیات کے بارے میں محتاط رہو اور اُن عقاید کا ذکر زبان پر مت لاؤ جو خلافی مسائل ہیں کیونکہ اس طرح مختلف مذہبوں فرقوں اور جماعتوں میں اختلاف کی خلیج بڑھتی چلی جاتی ہے اور قوم کی شیرازہ بندی نہیں ہوسکتی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہندوستانی قوم ایک واحد قوم بن جائے تو اُن عقاید کا ذکر کیا کرو جو تمام مذاہب میں مشترکہ عقاید ہیں۔ کیونکہ مختلف فیہ مسائل کا ذکر کرنا باہمی مخاصمت اور دُشمنی کو بڑھائیگا اور مشترکہ عقاید کا ذکر کرنے سے دوستی اتحاد اور یگانگت کا رابطہ قائم ہوگا ✣

چنانچہ مشہور بدھ معلم ڈاکٹر پی کلاراٹنے (Kularatne) نے جو کولمبو کے آنند کالج کے پرنسپل ہیں۔ گذشتہ سال جمعیت المذاہب عالم (World Congress of Faiths) کے اجلاس میں جو کیمبرج میں منعقد ہوا تھا دوران تقریر میں فرمایا :-

"مختلف مذاہب والوں کو چاہئے کہ اہم اور غیر اہم اختلافی مسائل پر بحث نہ کیا کریں۔ اس کی بجائے ان کو اس بات کا تہیہ کر لینا چاہئے۔ کہ مشترکہ عقاید کا تذکرہ اور اقرار کیا کریں۔ "کافر" وغیرہ الفاظ کا استعمال یک قلم بند کر دینا چاہئے اور ایک دوسرے کو مختلف ناموں سے نہیں پکارنا چاہئے۔ ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم اپنی جماعتوں کے نومریدوں کی مردم شماری بڑھاتے نہ رہیں۔"

علاوہ ازیں ہمارے لیڈر ہم کو یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ جو اختلافی مسائل ہیں وہ محض عارضی اور غیر ضروری ہیں اور مشترکہ عقائد اصلی بنیادی اور لازمی اور ضروری عقاید ہیں۔ پس ہم کو چاہئے کہ مقابلۂ مذاہب میں عارضی اور غیر ضروری باتوں کا ذکر چھوڑ کر اصلی اور بنیادی باتوں کا ذکر کریں تاکہ تمام مذاہب کے پیرو صلح اور اتفاق کی جانب مائل ہوں اور ہندوستان ایک قوم ہوجائے۔ وہ آئے دن یہ بھی پرچار کیا کرتے ہیں کہ اختلافی مسائل کا ذکر چھیڑنا عبث ہے۔ کیونکہ روزمرہ زندگی کی عملی ضروریات کا ان امور سے تعلق نہیں پس ان کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ مسائل کے اختلاف پر بحث کرنا ناحق کی دردسری مول لینا ہے۔ بس اللہ کو مانو اور نیک عمل کرو۔ یہ کافی ہے۔ "ہندو" "مسلم" "مسیحی" کی تمیز کو مٹادو کیونکہ ان اختلافات کے قائم رہنے سے قوم کی سیاسیات پر اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ مسٹر ڈیسائی نے ایک لیکچر کے دوران میں کہا :-

"جس روز ہندوستان کے باشندے اپنے آپ کو "ہندو" اور "مسلم" کے نام سے موسوم کرنا بند کردینگے اس روز ہندوستان آزاد ہوجائیگا"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۹ فروری ۱۹۳۶ء)

ہمارے مخاطب کہتے ہیں بس خُدا کو مانو اور باقی جھگڑے چکا دو۔ لیکن کیا یہ بات سچ ہے کہ تمام مذاہب خُدا کی ہستی کو مانتے ہیں؟ کیا ہندو مذہب میں بعض فرقے ایسے نہیں جو سرے سے خُدا کے قائل ہی نہیں؟ کیا دہریت کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہے؟ دُور کیوں جاؤ خود ہمارے مُلک ہندوستان میں ہزاروں خُدا کے بندے ایسے موجود ہیں جو ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہمنوا ہو کر کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان سے خُدا کو نکال

دیا جائے تو آج اتحاد ہو سکتا ہے۔ پس واجب تو یہ ہے کہ مذہبی رواداری کے حامی لگے ہاتھوں اس بات پر اصرار کریں کہ مختلف مذاہب کا یہ فرض ہے کہ خُدا کا انکار کریں تاکہ ہندوستان کی قوم کی شیرازہ بندی ہو سکے۔ اِسے

لگا نہ رہنے دے جھگڑے کو یار تو باقی　　رُکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگِ گلو باقی

ہمارے قومی لیڈر مذہبی رواداری کا سبق دیتے وقت ہم کو اس بات کی بھی تلقین کرتے ہیں کہ قومی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر ہم کسی مذہب پر نکتہ چینی نہ کریں۔ کیونکہ اس طرزِ عمل سے لوگوں کے دلوں پر چوٹ لگتی ہے اور طرفین کے جذبات مجروح ہو کر برانگیختہ ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ فرقہ دارانہ فسادات ہوتے ہیں جو قومی اتحاد میں سدِ راہ ہوتے ہیں ⁂

—— (۲) ——

جب ہم ان قومی رہنماؤں کی تقریروں اور تحریروں کو غور سے دیکھتے ہیں تو ہم پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مذاہب کو رواداری کا سبق مذہب کی خاطر نہیں بلکہ قومیت کی خاطر دیا جاتا ہے اور سبق دینے والوں نے نہ مذاہب کا مطالعہ کیا ہے اور نہ وہ مذہبی اختلافات کی اہمیت سے واقف ہونے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ یہ اصحاب مذہبی امور میں فکر، غور، تجسّس اور تفحص سے قطعاً بے نیاز ہوتے ہیں اور رواداری کے حامی بن کر مبلغینِ مذاہب پر دفعہ ۱۵۳ کا نفاذ کر کے عامۃ الناس سے خراجِ تحسین وصول کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح دیگر بے سر و پا مبہم اور بے معنی الفاظ زبان زدِ خلائق ہوتے ہیں۔ اسی طرح مذہبی رواداری کا لفظ بھی ہمارے سیاسی لیڈر وقت اور بے وقت موقعہ اور محل دیکھے بغیر طوطے کی طرح رٹ کر سُنا دیتے ہیں۔ لیکن اُن کے اذہان میں اس کا کوئی خاص معیّن

مفہوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ رواداری کے اصل مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ تقریروں اور تحریروں سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کو غور و فکر کرنے کی عادت نہیں ہوتی۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ لیڈر وہ شخص ہوتا ہے۔ جو غوغا آرائی کر سکے اور وقت بے وقت جا اور بے جا اپنے مخالفوں کے خلاف اخبارات اور پلیٹ فارم پر سے دھواں دھار تقریریں اور عامیانہ حملے کرتا رہے۔ وہ عوام الناس کو خوش کرنے کے لئے اُن کی سی بات کہہ دیتے ہیں اور اپنی ضمیر پر چلنے والے با اصول آدمیوں کو بے باکانہ پامال کر دیتے ہیں تاکہ اُن کی لیڈری میں کسی قسم کے خلل کا احتمال پیدا نہ ہو ⁂ سے

معشوقِ ما بمذہبِ ہر کس برابر است　　با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

ایسے لیڈروں کی عبرت کی خاطر ہم یہاں مرحوم لارڈ مارلے کی کتاب "رواداری" کی عبارت نقل کرتے ہیں تاکہ وہ اِن پر غور کر کے اپنے زاویۂ نگاہ کو بدل سکیں۔ لارڈ مرحوم فرماتے ہیں[1] :-

جوں جوں سیاسی ذمہ داری بڑھتی گئی ہے ہماری دماغی ذمہ داری کم ہوتی گئی ہے۔ لیکن سوسائٹی کی بہبودی اسی میں ہے کہ یہ خلیج بڑھنے نہ پائے۔ اگر سیاسیات ہماری زندگی پر غالب ہو گی تو ہماری وسیع النظری جاتی رہیگی اور صرف وہی باتیں ہماری دلچسپی کا موجب ہوں گی جن کا ہماری مادی خوشحالی کے ساتھ براہِ راست تعلق ہو گا۔ باقی تمام اُمور یا نظر انداز ہو جائینگے یا ادنےٰ درجے کے متصوّر ہونگے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم کے افراد اُن اثرات سے الگ رہینگے جو در حقیقت، قوم کو سب سے زیادہ تقویت پہنچاتے ہیں اور خیالات کو وسعت، اور رفعت بخشتے ہیں اور عالی دماغ انسان پیدا کرتے

[1] John Morley, on Compromise. chapter 3

ہیں۔ اوّل۔ وہ ان تمام زبردست اور وسیع مسائل کی طرف سے لاپروائی اختیار کر لیتے ہیں۔ جن کی جانب انسان ہمیشہ متوجہ رہا ہے۔ دوم اُن میں یہ خواہش نہیں رہتی کہ ہر چہ بادا باد ہم دلیرانہ اُن مسائل کے جواب کی تلاش میں لگے رہیں گے۔ اور اگر ہم کو کوئی یقینی جواب نہ ملا۔ تو کم از کم ہم کو یہ تسلی تو ہوگی کہ ہم نے اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ عوام الناس تو اس قسم کے مسائل کی پرواہ بھی نہیں کرتے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس زُمرہ میں نہ صرف عوام الناس ہی داخل ہیں بلکہ ایسے اشخاص بھی پائے جاتے ہیں جو ان مسائل کی اہمیت سے واقف ہوتے ہیں لیکن ان کے دماغوں پر سیاسیات اس قدر مسلط ہوتی ہے کہ اُن کو یہ خدشہ ہر وقت دامن گیر رہتا ہے کہ اگر انہوں نے ان مسائل پر آزادانہ بحث کی تو ان کے حق میں اس کا نتیجہ کہیں مضر ثابت نہ ہو۔ پس وہ اس بحث کے نزدیک نہیں پھٹکتے اور ان اہم اُمور کے متعلق رائے قائم کرنے سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اُن کو یہ خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے کوئی رائے قائم کر دی جو اُن کے خیال میں راست ہوگی تو وہ لوگوں کی نظروں سے اُتر جائیں گے اور ان پر وہی مثل صادق آئیگی کہ کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو۔ ایسے لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کوتاہ ہے۔ مبلّغین کی جماعت میں شامل ہونا اُن کے مرغوبِ خاطر نہیں ہوتا۔ شہداکی جماعت میں وہ داخل ہونا نہیں چاہتے۔ نہ وہ لوگ کہ شہیدوں میں شمار ہونا چاہتے ہیں۔ پس وہ کہتے ہیں کہ نہ ان باتوں پر متوجہ ہو اور نہ اپنی جان کو ہلکان کرو۔ بس نہ کوئی رائے قائم کرو اور نہ اُس رائے کو ظاہر کرو۔ ایسے طریقہ کار سے دنیا میں صلح اور آدمیوں میں رضامندی قائم ہوگی .....

اگر اس طریقۂ کار کا کوئی اور ضرر رساں نتیجہ نہیں ہوتا تو کم از کم یہ ضرور ہوتا ہے کہ ہماری ذمہ داری کا احساس کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ احساس پہلے تیز کانٹے کی طرح ہم کو چُبھتا تھا کہ ہم کسی خدا کے سامنے یا سوسائٹی کے سامنے یا کم از کم اپنی ضمیر اور ذہنی خودداری کے سامنے ذمہ دار ہستیاں ہیں جن کو ہم نے جواب دینا ہے۔ وہ لوگ جن کو ہم دقیانوسی خیال کیا کرتے ہیں یہ مانتے تھے کہ اُن کی رُوح کی نجات کا تمام دارومدار حق کی قبولیت اور اس کے اعلان پر منحصر ہے۔ اس قسم کی بزرگ ہستیاں بنی نوع انسان کے لئے باعث فخر تھیں لیکن دورِ حاضر میں ہم چراغ لے کر بھی ڈھونڈھیں تو ہم کو ایسے شخص نہیں ملتے جن کی زندگیاں ہم کو حق کی خاطر لڑنے مرنے پر مائل و متحرک کر سکیں۔ انگلستان کے متشرع پیوری ٹن ہماری نگاہوں میں شجاع نظر آتے ہیں حالانکہ نہ ہم ان کے عقائد کے معترف ہیں اور نہ ان کے مجنونانہ جوش کے حامی ہیں لیکن ہم ان کی اس واسطے قدر کرتے ہیں اور ان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ حق کے متلاشی تھے اور حق کے اعلان کرنے میں وہ ذرا تامل نہ کرتے تھے۔ وہ اعلانِ حق کے وقت یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ کیا یہ وقت اعلان کے لئے مناسب اور موزوں ہے یا نہیں۔ کیا عوام الناس کی کثیر جماعت ہماری حمایت کرے گی یا نہیں۔ کیا اس کے کہنے سے ہم کو کوئی نقصان پہنچے گا یا نہیں۔ بلکہ ان میں سے ہر شخص حق کی خاطر اس طرح قائم رہتا تھا کہ گویا وہ ہر وقت خدا کی نگاہ کے سامنے کھڑا ہے؟

(۳)

سابق وزیرِ ہند مرحوم نے مندرجہ بالا عبارت میں ہندوستان کے موجودہ لیڈروں کی گویا فوٹو اُتار کر رکھ دی ہے اور عقلی دلائل کے ذریعہ ان کو اُن کی موجودہ روش کا نتیجہ بھی سمجھا دیا ہے۔ لیکن ہندوستان کے خود غرض لیڈر بیچارے پیٹ کے غلام ہوتے ہیں۔ ان کی بڑی صفت یہ ہے کہ وہ علم اور عقل سے بالعموم خالی ہوتے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس شخص نے مذہبی رواداری کے متعلق غور و فکر کرنے کی زحمت تک گوارا نہ کی ہو اور جس کی بداعمالیاں ظاہر کرتی ہوں کہ خُدا اس سے بیزار ہے اور جو مذہب کے نام سے بیزار ہو اور اس کو ہندوستان کے حق میں لعنت کا طوق سمجھتا ہو۔ اس کو مذہبی رواداری کا سبق پڑھانے کا کوئی اختیار نہیں ہو سکتا اور نہ ایسے شخص کی رواداری کو عقلی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے کوئی وقعت دی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس کی رواداری اور مسالمت اس کے عقلی افلاس اخلاقی انحطاط اور اس کی رُوحانی پست حالی کی دلیل ہو گی ✣

سچ تو یہ ہے کہ بُزدلی اور کاہلی نے ہماری قوم میں ایک بے قاعدگی اور غیر ذمہ دارانہ آزادہ روی پیدا کر دی ہے جو اپنے آپ کو مذہبی رواداری کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ درحقیقت یہ حالت اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے خیالات بے ربط ہیں اور ہم میں یہ لیاقت یا خواہش موجود نہیں کہ ان کو کسی نظام میں باہم پیوستہ کریں۔ ہمارے مُلک میں خیالات اور نظریوں کی بھرمار ہے۔ لیکن چُونکہ ان میں باہم کوئی ربط رشتہ یا سلسلہ نہیں ہوتا لہٰذا وہ بے لگام ہوتے ہیں اور عامۃ الناس لیڈروں اور اخبار کے ایڈیٹروں کے خیالات کے رحم پر ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گو ہم تقریبا

اور بحث میں غوغا آرائی کر سکتے ہیں۔ لیکن غور و فکر کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ غور کا مقام ہے کہ اُس قوم کا حشر کیا ہو سکتا ہے جو رواداری اور لاپروائی میں تمیز نہ کر سکے۔ اور دُنیا اور آخرت دونوں جہانوں کے اہم ترین سوالوں کی جانب بے نیازی اور غیر جانبداری اور بے پروائی اختیار کر لے؟

خیالات کی بے ربطی اور تصوّرات کی بے قاعدگی اور الفاظ کا غیر معین مفہوم اِس مصنُوعی رواداری کی بنیادیں ہیں اور مسٹر گاندھی کی تحریروں اور تقریروں کی یہ خصُوصیت ہے کہ وہ الفاظ کو استعمال کرتے وقت اُن کے مفہوم کو متعیّن اور مقرر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کیا کرتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے خیالات پراگندہ اور پریشان ہوتے ہیں۔ مثلاً ہریجن کی اشاعت مارچ ۳۰ر ۱۹۳۷ء میں آپ کہتے ہیں کہ:—

"مس لیسٹر (Miss Lester) کے لئے لفظ "مسیح" کا خواہ کچھ ہی مفہوم ہو میرے لئے تو وہ کسی ایک شخص کا نام نہیں بلکہ وہ ایک صفت ہے جس کا موصوف کوئی ایک تاریخی شخص نہیں ہے۔ پس ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے مذاق کے مطابق جس معلم اور پیشوا کو یا کسی ایک منزہ عن الخطا شخص پیشوا معلم اور ہادی کو حق مانے اور اس کو مسیح کہے"

مسٹر گاندھی کے خیالات کی پریشانگی کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو ان اہم امُور پر غور و فکر کرنے کی فرصت اور عادت نہیں اور آپ الفاظ کو ان معنوں میں استعمال کرتے ہیں جن معنوں میں وہ بالعموم مستعمل نہیں ہوتے اور ان کو استعمال کرنے سے پہلے اپنے مفہوم کو معین نہیں کرتے۔ کیونکہ اس کے لئے سوچ بچار کی ضرورت ہے اور سوچ بچار کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔ لیکن بیچارے مسٹر گاندھی کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ ان باتوں پر غور و خوض کرنے کے لئے فرصت نکالیں +

ے پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر   بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

(۴)

ہمیں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ حق کو چھپانے سے ہم حق کی قدر اور منزلت کو کم کرتے ہیں اور جیسا مرحوم لارڈ مارلے کہتے ہیں کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی جس نے حق کے دلیرانہ اظہار کا سبق نہیں سیکھا۔ پس جب قوم پرست ہم کو یہ صلاح دیتے ہیں کہ قوم کی خاطر اپنے خیالات کو جن کو تم سچ مانتے ہو دوسروں پر ظاہر مت کرو تو ہم حیران ہو کر پوچھتے ہیں کہ کیا یہ صاحبان قومیت کو غلط رائے عامہ کی بنیاد پر۔ دُنیا کی نکمّی شان و شوکت و حشمت پر۔ خود غرضی اور ہوس پرستی پر اور ان تمام باتوں پر جو حق اور رُوحانیت کے منافی ہیں قائم کرنا چاہتے ہیں؟ کیا کوئی شخص جو منافق ہو خود دار ہو سکتا ہے؟ اور کیا منافقانہ بنیاد پر ہندوستان کی قوم کی عمارت کھڑی ہو سکتی؟ ے

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج   تا ثریا میرود دیوار کج

یہ مصنوعی رواداری قوم کے حق میں سمِّ قاتل ثابت ہو رہی ہے کیونکہ اس کے زیر اثر ہمارے ملک کے نوجوان سوچنے کی زحمت اُٹھانا نہیں چاہتے اور مذہب اور اخلاق اور رسُوم کے معاملہ میں یا تو یہ دلیری کے ساتھ جھوٹے اصُول کی حمایت کرتے ہیں اور یا منافقانہ طور پر اخفائے حق کرتے ہیں اور اپنی حکمتِ عملی پر فخر اور ناز کرتے ہیں۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

ان کا رویہ ثابت کرتا ہے کہ مذہب ان نوجوانوں کی زندگیوں پر حکمران نہیں رہا۔ ان کی ضمیر ان کو ملامت نہیں کرتی اور تلاش حق کے ساتھ ہی

ذمہ داری کا احساس بھی رُخصت ہو گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب بُری رُوح انسان کے دل کو مذہب سے خالی پاتی ہے وہ سات اور بُری رُوحیں اپنے ہمراہ لاتی ہے اور اس شخص کا حال پہلے سے بدتر ہو جاتا ہے (لوقا $\frac{۱۱}{۲۶}$)

(۵)

بعض اوقات ہم کو یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم کسی عقیدہ کو درست اور راست سمجھتے ہو تو اس کو مان لو۔ یہ تمہارا حق ہے کہ تم اپنے کسی عقیدہ کو حق اور سچا سمجھو اور یہ حق تم سے کوئی نہیں چھینتا لیکن تم کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کا خواہ مخواہ لوگوں میں جا اور بے جا۔ وقت بے وقت چرچا کرتے پھرو۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حق اور راستی کسی کے باپ کا ترکہ اور میراث نہیں ہوتے اور نہ کوئی شخص زمین اور جائداد کی طرح ان کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص یہ جانتا ہے کہ اس کو سچائی مل گئی ہے وہ ایک امین کی طرح ہوتا ہے جس کے پاس ایک امانت پڑی ہے جو کل بنی نوع انسان کی ملکیت ہے۔ اس کو چین نہیں آسکتا تاوقتیکہ وہ امانت کا حق ادا نہ کرے۔ اور اگر وہ خاموش رہے یا اخفا کرے تو خیانت کا مجرم ہو گا۔ حق کو جاننے کی وجہ سے قوم کی ترقی کی امانت اس کی تحویل میں ہے۔ پس اگر وہ خاموش رہیگا یا اخفا کرے گا تو جھوٹ اور ناراستی کے عناصر غالب آکر قوم کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینگے جس طرح جسم میں زائد مادہ رہ کر بدن میں زہر پھیلا دیتا ہے۔ پس جو شخص اخفائے حق کرتا ہے یا اعلان حق سے گریز کرتا ہے وہ درحقیقت نوع انسانی کا خائن اور قوم کا غدار ہوتا ہے ✤

(۶)

مصنوعی رواداری کے مبلغین یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ ایک راسخ الاعتقاد شخص کے اعتقادات کی حدود کو تنگ دلی اور عدم رواداری پر محمول کرتے ہیں اور لوگوں میں اس کے خلاف پراپیگنڈا کرتے ہیں تاکہ ایسے شخص کے طرزِ عمل کو اس کی اخلاقی پستی کا نتیجہ تصوّر کر لیا جائے۔ رواداری بظاہر نہایت اعلےٰ اور فراخ شے دکھائی دیتی ہے۔ پس بعض انسان اس خوف سے کہ مبادا لوگ ان کو تنگ خیال ہونے کا طعنہ دیں اپنے ایمان و عقائد کو لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے۔ لیکن اس قسم کا رویّہ نہایت بزدلانہ رویّہ ہے۔ کسی باغیرت انسان کا یہ کام نہیں کہ وہ اس قسم کے خوف کے مارے اپنے ایمان و عقائد کو ترک کر دے۔ اس قسم کی رواداری حقیقی فراخدلی نہیں ہوتی بلکہ وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایسے شخص کے عقائد کا اُس کی عملی زندگی پر کوئی اثر نہیں۔ اور وہ ایمانیات کی جانب سے لاپروا ہے۔ اُس کا دل نورِ ایمان سے بے بہرہ ہے یا اس کا ایمان مُردہ یا نیم مُردہ ہے لیکن جب کسی شخص کا دل نورِ ایمان سے منوّر ہوتا ہے اور اس کا زندہ ایمان اور زندہ عقائد کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے اس قسم کی غلط فراخ دلی کافور ہو جاتی ہے اور وہ عصبیت اور عدم رواداری میں تبدیل ہو جاتی ہے جو دوسروں پر ناجائز حملے نہیں کرتی بلکہ اپنے عقائد پر قائم رہ کر ازراہِ محبّت نڈر ہو کر دوسروں پر اپنے خیالات ظاہر کرنے سے نہیں شرماتی۔

(۷)

ہمارے سیاسی لیڈر پولیٹکل امور میں خود اپنی تعلیم و تبلیغ پر عمل نہیں کرتے۔ مثلاً کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلافات ہیں۔ کانگرس

کے اندر ایک پارٹی گاندھی جی کی حامی ہے اور دوسری مسٹر سوبھاش چندر بوس کی حمایت کرتی ہے۔ اور دونوں پارٹیاں اپنے اختلافات کو جو محض عارضی اور ذاتی ہیں دُور کر کے ایک دوسرے سے رواداری کا سلوک نہیں کرتیں۔ بلکہ اُن اختلافات کو مدِّ نظر رکھ کر کبھی مسٹر نریمان پر سیاست کی جاتی ہے۔ کبھی ڈاکٹر کھارے پر عتاب نازل ہوتا ہے۔ کبھی سبھاش بابو کو کانگرس سے خارج کیا جاتا ہے حالانکہ سب کا نصب العین ایک ہی ہے۔ پس سیاسی معاملات میں اختلافات کو مٹا دینے کے وقت رواداری کے حامیوں کی زبانوں پر مہرِ سکوت لگ جاتی ہے بلکہ اس کے برعکس ان اختلافات کو قائم رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب فروری ۱۹۴۰ء میں مسٹر گاندھی بنگال ڈھاکہ میں مالیکنڈہ گئے تو بعض لوگوں نے آپ کے خلاف مظاہرہ کیا۔ تب آپ نے دورانِ تقریر میں فرمایا:-

"اگر آپ حقیقی معنوں میں میرے پیرو ہیں تو آپ کو ان مظاہروں سے ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ جو لوگ میرے ساتھ اتفاق نہیں رکھتے ان کا حق ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اگر گاندھی ازم کی پُشت پر کوئی سچائی نہیں تو قدرتی طور پر اُس کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن اگر گاندھی ازم سچائی کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے تو وہ مظاہروں کے باوجود بھی زندہ رہیگا۔ ہمارے درمیان اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن اگر ہم پُرامن طور پر اپنے خلاف نعرے نہیں سُن سکتے اور اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کی طرف دوستانہ سپرٹ کا اظہار نہیں کر سکتے تو ہم عدم تشدد پر کاربند ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے ... میں نے ابھی ابھی بعض لوگوں کو گاندھی ازم مُردہ باد کے نعرے لگاتے سُنا ہے جو لوگ گاندھی ازم کو تباہ کرنا چاہتے ہیں ان کو ایسا کہنے کا پورا

حق ہے۔۔۔ جو لوگ گاندھی ازم کے خلاف کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ انہیں بولنے
کی آزادی دو۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کے خلاف
کینہ کو اپنے دلوں میں جگہ نہ دو جب تک پُرامن طور پر آپ اپنے مخالفین
کی برداشت نہیں کر سکتے آپ اہمسہ کا سبق نہیں سیکھ سکتے۔۔۔۔ وہ
جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں۔ ہم ایک دوسرے کو دشمن کیوں سمجھیں۔ ہمارے
درمیان اختلاف ہے۔ اس کے باوجود ہمیں ایک دوسرے کو دوست
سمجھنا چاہئے" (پرتاپ ۲۲ فروری ۱۹۴۰ء)

اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں:۔

"پریس کی آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ ہم صرف ان باتوں کے شائع ہونے
کی اجازت دیں جو ہم چاہتے ہیں کہ شائع ہوں۔ جابر اور ستمگر فرمانروا بھی
اس قسم کی آزادی کی حمایت کریگا۔ بلکہ ملکی آزادی اور پریس کی آزادی
کا یہ مطلب ہے کہ ہم ان باتوں کے شائع ہونے کی اجازت دیں جو ہمارے
خیال میں ہمارے اغراض و مقاصد کے منافی ہیں" (ٹربیون ۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء)

ہم حیران ہیں کہ پولیٹیکل امور میں تو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ باہمی اختلافات
کو نظر انداز نہ کرو۔ بلکہ صبر اور تحمل۔ برداشت اور شانتی سے ایک دوسرے
کی سُنو ورنہ قوم کا شیرازہ بکھر جائیگا۔ لیکن مذہبی امُور میں جو سیاسی امُور
سے بدرجہا اہم ہیں۔ ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ باہمی اختلافات کو نظر انداز
کردو اور پبلک کے سامنے اُن کا نام تک نہ لو۔ ورنہ قوم کا شیرازہ بکھر جائیگا
چنانچہ ۲۱ جنوری ۱۹۳۷ء کے روز مسٹر گاندھی نے کوٹیم میں ہندوستانی
مسیحیوں کو مخاطب کر کے کہا :۔

"مسیحی جانتے ہیں کہ ان میں اور مجھ میں ایک غیر مرئی لیکن مضبوط

رابطۂ اتحاد ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ مسیحیوں کی ایک بڑی تعداد میرے
ساتھ یہ مانتی ہے کہ دُنیا کے تمام بڑے مذاہب برحق ہیں۔ مجھے بڑے
درد سے کہنا پڑتا ہے کہ مَیں ہندوؤں کے توہمات سے واقف ہوں
لیکن باایں ہمہ مَیں ہندو رہونگا۔ کیونکہ مَیں یہ نہیں مانتا کہ ہندو مت
کے بُنیادی اصُول دیگر بڑے مذاہب کے اصُولوں سے مختلف ہیں۔
مجھے اس بات کا پُورا یقین ہے کہ دُنیا میں صلح اور آدمیوں میں رضامندی
تب ہی قائم ہو سکتی ہے۔ اگر ہم مذہبی بحث مباحثہ میں نہ اُلجھیں کیونکہ
ایسا کرنا بے سُود ہوتا ہے"۔

واجب تو یہ ہے کہ مسٹر گاندھی مذہبی امُور کے متعلق بھی اسی قسم
کا ایک اعلان کریں کہ :۔

"جو لوگ میرے مذہب کے ساتھ اتفاق نہیں رکھتے ان کا حق ہے کہ اپنی
رائے کا اظہار کریں۔ اگر میرے مذہب کی پُشت پر سچائی نہیں تو اس کا
خاتمہ ہو جائیگا لیکن اگر وہ سچائی کی ٹھوس بُنیادوں پر قائم ہے تو وہ
نکتہ چینی کے باوجود زندہ رہیگا۔ مذاہب کے درمیان اختلافات ہو سکتے
ہیں۔ لیکن اگر ہم پُرامن طور پر اپنے مذہب کے خلاف تقریریں نہیں
سُن سکتے اور اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کی طرف دوستانہ سپرٹ
کا اظہار نہیں کر سکتے تو ہم عدم تشدد پر کاربند ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔
جو لوگ میرے مذہب کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو ایسا کرنے کا پورا حق
ہے۔ جو لوگ ہندو دھرم کے خلاف کچھ کہنا چاہتے ہیں انہیں اس کی
آزادی دو۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کے خلاف کینہ
کو اپنے دلوں میں جگہ نہ دو۔ جب تک پُرامن طور پر آپ اپنے مذہب کے

مخالفین کی برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ آہمسہ کا سبق نہیں سیکھ سکتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں۔ ہم ایک دوسرے کو دشمن کیوں سمجھیں ہمارے درمیان اختلاف ہے اس کے باوجود ہمیں ایک دوسرے کو دوست سمجھنا چاہئے"۔

آپ ہی اپنے طرزِ عمل کو دیکھیں ۔۔۔ ہم جو کچھ عرض کرینگے تو شکایت ہوگی

(۸)

جب ہم مسٹر گاندھی کی تقریروں اور تحریروں پر نظر کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خود ہندو مذہب کی نکتہ چینی کرتے ہیں اور بعض اوقات ہندو مت کے اصول سے الگ اپنی رائے قائم کر کے اس کی صداقت پر اصرار کرتے ہیں۔ اور یہ رویہ ان کے خود ساختہ اصول رواداری کے خلاف ہے۔ مثلاً آپ نے ایک دفعہ فرمایا:۔

"میں یہ مانتا ہوں کہ ورن آشرم کے متعلق جو تعلیم سمرتیوں اور دوسرے شاستروں میں دی گئی ہے وہ میرے عقیدہ کے خلاف ہے۔ میرے خیال میں شاستروں کا ایک ایک لفظ الہامی نہیں۔ شاستروں میں جو باتیں علم عقل اور اخلاق کے خلاف ہیں وہ غلط ہیں اور قابلِ قبول نہیں"

(ہندوستان ٹائمز ۲۵ نومبر ۱۹۳۵ء)

جب گاندھی جی خود ہندو شاستروں کی بعض تعلیمات کو علم عقل اور اخلاق کے خلاف تسلیم کرتے ہیں اور وہ خود ان باتوں کو جو آپ کے اپنے عقیدہ کے خلاف ہیں غلط قرار دینے سے نہیں جھجکتے خواہ وہ سمرتیوں میں درج کیوں نہ ہوں تو وہ کس منطق کی رو سے غیر ہنود سے ہندو اصول و عقائد کو نیک نیتی سے پرکھنے کا حق چھین سکتے ہیں؟ ہندوستانی قوم

کی حقیقی فلاح اور بہبودی اسی پر منحصر ہے کہ خیالات کی مکمل طور پر چھان بین اور پڑتال کی جائے اور صحیح کو غلط سے جدا کر کے باطل کو ترک کر دیا جائے اور صداقت کو اختیار کیا جائے۔ لیکن صحیح کو باطل سے تب ہی جدا کیا جا سکتا ہے جب اختلافات کو نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ ان کو پیش نظر رکھا جائے اور نیک نیتی سے ان کو "علم و عقل اور اخلاق" کی کسوٹی پر پرکھا جائے ؂

(۹)

حق تو یہ ہے کہ ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے عقائد سے جن کو وہ دل سے قبول کرتا ہے بے وفائی اور غداری نہ کرے۔ جو شخص آج ایمانیات کو قومیت پر قربان کرنے کو تیار ہے وہ بے باکی سے کل کے روز قومیت کو کسی اور شئے پر بے دریغ قربان کر دیگا۔ اگر کسی شخص کا یہ ایمان ہے کہ اس کے عقائد درست صحیح اور عالمگیر ہیں یا کسی دوسرے کے عقائد غلط ہیں اور وہ جہالت اور ضلالت میں پڑا ہے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات کا علانیہ اظہار کرے۔ اگر وہ حق پر ہے تو دوسروں کو راہِ راست پر لائے اور اگر وہ غلطی پر ہے تو خود گمراہی سے بچے۔ اگر ہندو مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے کے اختلافات کو نظر انداز کرنے کی بجائے ان کو نگاہ میں رکھیں اور تحقیقِ حق کی خاطر تبادلۂ خیالات کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ محض اختلافات کا وجود ان کی باہمی پرخاش و جنگ و فساد کا موجب ہو۔ حق تو یہ ہے کہ اگر مختلف مذاہب ایک دوسرے کے اختلافات کو نگاہ میں رکھیں تو اصلی اتحاد کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ مثلاً اگر زید یہ جانتا ہے کہ بکر کا نکتہ نگاہ اس سے مختلف ہے تو وہ

بکر کے قول و فعل کو اس کے خیالات کی روشنی میں سمجھ سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اس نے فلاں بات کیوں کہی اور فلاں کام کیوں کیا اور اس طرح طرفین میں سمجھوتہ ہو سکتا ہے جو دوستی اور اتحاد کا رابطہ قائم کرنے میں ممد و معاون ہو سکتا ہے لیکن اگر بکر زید کو کہے کہ ہم دونو کا نقطۂ نگاہ فی الحقیقت ایک ہی ہے اور ہم میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے تو زید کو بکر کے اقوال و افعال پریشان کر دیں گے۔ اور وہ اپنے دل میں بکر کو منافق خیال کرنے میں حق بجانب ہوگا پس واجب تو یہ ہے کہ زید اور بکر اس بات پر اتفاق کر لیں کہ وہ اپنے بنیادی اصول اور اختلافات کو نہیں چھپائینگے تب وہ اپنے باہمی تعلقات میں ان امور سے پرہیز کرینگے جن سے دوسرے کو چوٹ لگے اور دونو لگاتار اس کوشش میں رہیں گے کہ محبت سے دوسرے کو اپنا ہم خیال بنا لیں اور یہی روش حقیقی اتحاد مصالحت اور رواداری کی بنیاد ہو سکتی ہے ✣

چنانچہ ایک دفعہ مسٹر گاندھی کو ایک ہندو طالب علم نے لکھا کہ میرا ایک مسلمان دوست ہے ہم دونو ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں لیکن بت پرستی پر ہمارا جھگڑا ہو گیا ہے۔ میں کیا کروں۔ مسٹر گاندھی نے جواب دیا:۔

"اگر تمہارا دوست تم سے حقیقی محبت رکھتا ہے تو وہ بت پرستی کو متعصبانہ نگاہ سے نہ دیکھیگا جو دوستی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ دونوں کے خیالات اقوال و افعال ایک ہی قسم کے ہوں وہ دوستی پائدار نہیں ہو سکتی لازم ہے کہ دوست ایک دوسرے کے مختلف خیالات اور افعال کی برداشت کریں۔" (ینگ انڈیا [illegible])

(۱۰)

ہم کو ہر ممکن دلیل سے یہ سمجھایا گیا ہے کہ ہم کو دوسروں کے خیالات کی عزت قدر اور وقعت کرنی چاہئے۔ اور یہ بات درست اور تسلیم کرنے کے قابل بھی ہے لیکن اگر ہم پر یہ واجب ہے کہ ہم دوسروں کے خیالات کی قدر و منزلت کریں۔ تو لا کلام ہم پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ ہم

اپنے خیالات کی بھی قدر و منزلت کریں۔ لیکن اگر ہم اپنے خیالات کو پردۂ اخفا میں رکھینگے اور ان کو لوگوں پر ظاہر نہ کرینگے تو ہم کس طرح اپنے خیالات کی قدر اور وقعت کر سکتے ہیں؟ پس جہاں یہ لازم ہے کہ ہم صبر و تحمل اور محبت کے ساتھ دوسروں کی جو ہم سے اختلاف رائے رکھتے ہیں سنیں وہاں ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم خود اپنے خیالات کو اس قدر وقعت دیں کہ ہماری زبانیں ان کی حقیقی ترجمان ہوں۔ اور ترجمانی کرتے وقت ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ "تم محبت کے ساتھ سچائی پر قائم رہیں" (افسی ۴/۱۵) اور سامعین پر لازم ہے کہ وہ ہمارے خیالات کو صبر تحمل اور محبت کے ساتھ سنیں۔ خداوند مسیح کے سنہری قانون پر کہ "جیسا سلوک تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی کرو" (لوقا ۶/۳۱) عمل کرنے سے ہندوستانی قوم کی مختلف جماعتوں میں رابطۂ اتحاد قائم ہو سکتا ہے ✣

رواداری کا اصلی مفہوم

حقیقی رواداری یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ایمان کی حدود کے اندر رہ کر محبت کی رو سے اپنے عقائد کے علاوہ دیگر اشخاص کے عقائد کی برداشت کرے۔ اور جس طرح وہ خود چاہتا ہے کہ اس کے عقائد کو لوگ بے دریغ پامال نہ کریں وہ بھی دوسروں کے عقائد کو پاؤں تلے نہ روندے بلکہ ان کی واجبی قدر کرے اور اگر ان کو غلط تصور کرتا ہے تو محبت آمیز الفاظ میں دوسروں کو سمجھائے کیونکہ:۔

محبت صابر ہوتی ہے اور مہربان۔ محبت شیخی نہیں مارتی اور نازیبا کام نہیں کرتی اور نہ جھنجھلاتی ہے۔ وہ راستی سے خوش ہوتی ہے اور

"سب باتوں کی برداشت کرتی ہے" (۱ کر ۱۳/۴)

چونکہ ایسے شخص کا عقیدہ خود معین اور مربوط ہوگا وہ محبت کے ذریعہ دوسروں کے عقائد کو جانچ سکے گا۔ اور ان کو ازراہِ ہمدردی قدر سے دیکھے گا۔ اور ملائمت اور محبت بھرے دل سے گمراہوں کو سمجھا کر خود راستی پر قائم رہے گا اور دوسروں کو راہِ راست پر لائیگا۔ حقیقی رواداری کی بنیاد محبت اور صرف محبت پر قائم ہو سکتی ہے جو مسیحیت کا اصل الاصول ہے ۔

کوئی شخص جو خداوند مسیح کا حلقہ بگوش ہے اپنے ایمان کو پردۂ اخفا میں نہیں رکھ سکتا۔ ہمارے خداوند نے صاف فرمایا ہے کہ :۔

جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا اقرار کریگا میں بھی باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اس کا اقرار کروں گا مگر جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا انکار کریگا میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اس کا انکار کرونگا"۔ (متی ۱۰/۳۲)

مسیحی اصول کے اختلاف کی وجہ سے "خواہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا ہونا پڑے" اور صورت حالات اس قدر نازک ہو جائے کہ "آدمی کے دشمن اس کے اپنے گھر کے ہی لوگ ہو جائیں" (متی ۱۰/۳۵) پھر بھی کسی مسیحی کا یہ کام نہیں کہ ایمانیات کے امور میں وہ اپنے مذہب کے اصول اور اعتقادات سے غداری اور بے وفائی کرے۔ کیونکہ :۔

"جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے وہ اسے کھوئے گا اور جو کوئی مسیح اور انجیل کے واسطے اپنی جان کھوئے گا وہ اسے بچائے گا" (مرقس ۸/۳۵)

اب وقت آگیا ہے کہ ہم ہر قسم کے منافقانہ رویہ اور مصنوعی رواداری

کو ترک کر دیں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم دیگر مذاہب کے غلط اور برے پہلوؤں کی طرف سے آنکھ بند کرنے کی آزمائش میں نہ پڑیں۔ کیونکہ دروغ کے ساتھ رواداری کرنی درحقیقت حق کی مخالفت کرنی ہے۔ ایک جگہ مسٹر گاندھی لکھتے ہیں کہ :۔

"رواداری اور مصالحت کی بنیاد اس پر ہے کہ فریقین کچھ چھوڑ دیں۔ لیکن بنیادی امور میں ہم کسی بات سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بنیادی امور میں مصالحت کرنا درحقیقت فریق ثانی کے آگے ہتھیار ڈال دینا ہے۔ مصالحت صرف اس حالت میں ہو سکتی ہے جب فریقین بنیادی امور پر متفق ہوں"۔ (ہریجن ۳۰ مارچ ۱۹۴۰ء)

پس چاہیئے کہ جہاں مذاہب میں حقیقی اختلاف ہو اور ان کے اصولوں میں ایک خلیج حائل ہو ہم یہ نہ کہیں کہ دونوں اصول درست ہیں۔ فرق صرف نقطۂ نگاہ کا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ہم کو صاف علانیہ کہنا چاہیئے کہ دو متضاد اصولوں میں سے ایک غلط اور دوسرا صحیح ہے۔ کیونکہ اجتماع الضدین امر محال ہے لیکن ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہمارا طرزِ کلام ایسا ہو جس کے ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکے اور ہمارا نصب العین دوسروں کے جذبات مجروح کرنا نہ ہو بلکہ ہمارا اصلی مقصد یہ ہو کہ ان کی روحوں کو سچائی کی خاطر جیت لیا جائے۔

پس مسیحی کلیسیا پر لازم ہے کہ جب کبھی ان کے مبلغین کو ہندو مت یا اسلام کے عقائد پر نکتہ چینی کرنی پڑے تو وہ اپنے ناگوار فرض کو اس طور سے سرانجام دیں کہ دوسرے خیال نہ کریں کہ انکے عیوب و نقائص کو علانیہ ظاہر کر کے وہ ان کی قومیت اور جماعت پر حملے کرتے ہیں یا مسیح اور مسیحیت کی آڑ میں وہ بدیشی چیزوں اور خیالوں کی ہندی چیزوں اور خیالوں پر برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ یہ بات ہندوستانی مسیحی مبلغین کے اصلی ارادہ اور منشا کی ترجمانی نہیں بلکہ حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ ہندوستانی مسیحیوں کا اصلی مقصد یہ نہیں ہوتا کہ بدیشی چیزوں یا خیالوں یا غیر ملکی فلسفہ کا پرچار کریں بلکہ ہمارا حقیقی منشا یہ ہے کہ ہمارے ابنائے وطن ہندو اور مسلمان دونوں

خُدا باپ کی ازلی اور ابدی محبت سے جو وہ گنہگار انسان سے کرتا ہے واقف ہو جائیں اور خُداوند مسیح کے قدموں میں آجائیں جس نے اس لازوال محبت کو اپنی تعلیم اور عمل سے بنی نوع انسان پر ظاہر کیا +

مسیحی کلیسیا اور فرقہ دارانہ ذہنیت

کوئی شخص جس کے سر میں عقل ہے یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ مسیحیت کا وجود ہندوستانی قوم کے یک جا ہونے میں رُکاوٹ کا باعث ہے پس اس کی تبلیغ و اشاعت قومی مفاد کی بناء پر قانوناً بند نہیں کی جاسکتی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تبدیلیٔ مذہب سے غیر مسیحیوں کی تعداد و شمار پر ضرور اثر پڑیگا اور فرقہ دارانہ تناسب کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار میں ضرور فرق پڑیگا۔ لیکن مسیحی کلیسیا اپنی جماعت کی تعداد بڑھانے کی خاطر اور غیر مسیحیوں پر اپنا سیاسی غلبہ قائم کرنے کی خاطر لوگوں کو نجات کی دعوت نہیں دیتی بلکہ یہ اپنا فرض جانتی ہے کہ خُداوند کے حکم کی تعمیل کرے اور اپنے غیر مسیحی بھائیوں کو اُن کی غیر فانی رُوحوں کی نجات کی خوشخبری دے۔ ہندوستان کے مسیحی قوم کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ لیکن کسی ایک فرقہ کی ترقی کے خواہاں نہیں اور نہ وہ کسی ایک فرقہ کے سیاسی اقتدار اور غلبہ کو قائم رکھنے کی خاطر اپنے مالک اور منجّی سے غداری کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں +

(۱۱)

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہندوستانی کلیسیا نے ان فرقہ دارانہ لڑائیوں اور خانہ جنگیوں میں کبھی حصّہ نہیں لیا۔ بلکہ وہ آئے دن کے

ہندو مسلم فرقہ دارانہ فسادوں کو رنج اور افسوس کی نظر سے ہمیشہ دیکھتی رہی ہے۔ اس کی نگاہ ہمیشہ قومی اتحاد اور شیرازہ بندی پر رہی ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ جب ہمارے ہندو اور مسلم برادران لندن کی گول میز کانفرنس میں فرقہ دارانہ تناسب پر ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے تھے ہمارے ہندوستانی مسیحیوں نے فرقہ دارانہ تناسب کے اصول کو مذموم قرار دیا اور علانیہ کہا تھا کہ یہ اصُول ہندوستانی قوم کے حق میں سمِ قاتل ہیں۔ اس گول میز کانفرنس کے سامنے ہر ایک اقلیت نے سرکارِ برطانیہ کو اپنی گزشتہ خدمات کا واسطہ دے کر اپنے لئے خاص حقوق طلب کئے تھے۔ مسلمانوں نے کہا تھا کہ ہم اپنی وفاداری کے لئے ہندوستان بھر میں ممتاز ہیں۔ ہم نے نان کوآپریشن کے دنوں میں ہندوؤں کا ساتھ نہ دیا۔ ہم وہشت انگیز سیاسی تحریکوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ سکھوں نے کہا کہ ہم نے سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں زبردست پیمانے پر فوجی خدمات کی تھیں۔ یورپین اصحاب نے کہا کہ ہم نے ہندوستان کی اقتصادی ترقی کے لئے لاکھوں پونڈ صرف کر دیئے ہیں۔ لیکن ہندوستانی مسیحی کلیسیا کی "چھوٹی جھنڈ" نے سرکارِ برطانیہ پر اپنے احسان نہ جتلائے حالانکہ مسیحی کلیسیا اعداد و شمار کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں تیسرے درجہ پر ہے اور اس کو اپنی خدمات پر جو اس نے مادرِ وطن کی خاطر سر انجام دی ہیں بجا طور پر ناز ہے۔ یہ مسیحی مبلغین کی مخلصانہ کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہمارا ملک اقوامِ عالم کے درمیان سر اُٹھانے کے قابل ہو گیا ہے۔ ہندوستانی کلیسیا کی صرف ایک شاخ یعنی چرچ آف انڈیا نے بیس ہزار سے زائد سکول اور کالج تعلیم کی خاطر کھول رکھے ہیں رومی کلیسیا کے سکولوں

اور کالجوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، اور ان میں پندرہ لاکھ سے زیادہ ہندوستانی تعلیم پارہے ہیں۔ دَورِ حاضر کے ہزاروں لیڈر انہی سکولوں کی بدولت اور کالجوں کی طفیل اس قابل ہوگئے ہیں کہ ملک کی ہمہ تن خدمت کرسکیں۔ ان کے علاوہ کلیسیا نے ایک ہزار سے زائد شفاخانے کھول رکھے ہیں جن میں چالیس لاکھ سے زیادہ مریضوں کی روزانہ بغیر کسی مذہبی امتیاز کے خبرگیری کی جاتی ہے۔ ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مسیحی کلیسیا کے افراد ہندوؤں سے تین گنا اور مسلمانوں سے چار گنا زیادہ خواندہ ہیں ان تمام خدمات کے باوجود اور اپنے اعداد وشمار کے باوجود مسیحیوں نے گول میز کانفرنس میں اپنی جماعت کے لئے خاص حقوق طلب نہ کئے بلکہ فرقہ وارانہ اصول کی مذمت کی کیونکہ ہندوستانی مسیحی فرقہ وارانہ ذہنیت سے پاک ہیں۔ آل انڈیا کرسچین کانفرنس اور آل انڈیا کیتھولک کانگرس نے بار بار یہ اعلان کیا ہے کہ فرقہ وارانہ تقسیم اور فرقہ وارانہ تناسب ہندوستان کے قومی مفاد کے حق میں مُضر ہیں کاشکہ کانگریس بھی ایسا کرتی +

—— (۲) ——

حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں مسیحی کلیسیا ہی ایک فقط مذہبی جماعت ہے جو حقیقی معنوں میں قوم کی دلدادہ ہے اس امر کا حال ہی میں کانگرس کے چوٹی کے لیڈر مسٹر ستیا مورتی نے مدراس کالج میں اقرار کیا تھا۔ فرقہ وارانہ تقسیم مسیحیت کے اصول کے عین نقیض ہے۔ کیونکہ مسیحیت کے اصول الہٰی الفت اور انسانی اُخوت و مساوات پر مبنی ہیں مسیحیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ ہر قسم کے متنازعہ فیہ امر کا فیصلہ آشتی صلح اور محبت کے ساتھ کیا جائے لیکن فرقہ وارانہ ذہنیت کا رحجان یہ ہے کہ متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ طاقت کے مظاہرے سے کیا جائے۔ جب تک ہم فقط اپنی جماعت کی ضروریات اور حقوق پیش نظر رکھ کر اپنی جماعت اور فرقہ کو مقدم اور ہندی قوم

کے دوسرے فرقوں کو مؤخر سمجھیں گے۔ تب تک فرقہ وارانہ آتش بھڑکتی رہے گی۔ پس ان حالات کو پیش نظر رکھ کر ہندوستانی کلیسیا بے خوف و ہراس یہ اعلان کرتی ہے کہ باہمی فرقہ وارانہ کشمکش کا واحد علاج محبت کا وہ اصول ہے جو خُداوند مسیح ہندوستان کے مختلف فرقوں اور گروہوں جماعتوں اور ملتوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تاکہ تمام ہندوستانی محبت اُخوت اور مساوات کی لڑی میں منسلک ہو کر ایک واحد قوم بن جائیں۔ دیگر مذاہب قوم ہند کی تقسیم کر کے "پاکستان" اور "ہندوستان" قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان فرقہ پرست لوگوں کے لئے مذہب محض ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ان کا فرقہ دُنیاوی ترقی اقتصادی غلبہ اور سیاسی اقتدار حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن مسیحی کلیسیا مذہب کو دُنیاوی اغراض کا آلہ کار نہیں بناتی اور نہ بنانا چاہتی ہے۔ لیکن اس پر بھی ہمارے غیر مسیحی برادران مسیحی کلیسیا کے وجود کو قومی مفاد کے خلاف خیال کرتے ہیں! ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

مسیحی کلیسیا اور قومیت

مسیحیت کے مخالفوں کی زبان سے عام طور پر یہ سُنا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسیحی وطن اور قوم کے دُشمن ہیں۔ اس سنگین الزام کے ثبوت میں گاندھی جی اور ان کے ہم خیال ہندوستانی مسیحیوں کے مذہب اور ان کے وسیع نکتۂ نظر۔ ان کی بین الاقوامی سیاسی نگاہ۔ ان کی طرزِ رہائش رسُوم ورواج وغیرہ کو پیش کرتے ہیں۔ اس الزام کا اصلی سبب یہ ہے کہ الزام لگانے والے مسیحیت اور ہندوستان کو ہندو نکتۂ نظر اور

سودیشی کے تنگ زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جس طرح پانی اپنی سطح سے اُوپر نہیں چڑھ سکتا اسی طرح بعض ہندو اصحاب اپنے مذہبی تعصبات اور فرقہ وارانہ نکتۂ خیال سے اُوپر پرواز نہیں کرسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹر گاندھی اور اُن کے ہم خیال نام نہاد "قومی" لیڈروں کی ہندوستان کے تمام فرقوں اور حلقوں کے دلوں میں وہ عظمت نہیں رہی جو چند سال ہوئے اُن کو حاصل تھی جب وہ صدق دل اور خلوص نیت سے تمام جماعتوں اور فرقوں کو قومی نکتۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے ؛

مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ مسیحیوں کی عادات اور طرزِ رہائش قومیت کے منافی ہیں۔ ہم اس الزام کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ الزام فرض کرلیتا ہے کہ تمام ہندوستان کے لوگ کسی ایک طرزِ رہائش۔ لباس۔ تمدن وغیرہ پر اتفاق رکھتے ہیں جو قومی نکتۂ نگاہ سے کل قوم کا مقررہ معیار ہے اور ہندوستانی مسیحی اس قومی معیار کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتے۔ لیکن یہ اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی ایسا معیارِ زندگی نہیں اور نہ اس کی تاریخ میں کبھی ایسا معیار قائم کیا گیا ہے۔ غالباً مسٹر گاندھی کا اصلی مطلب یہ ہے کہ مسیحی جماعت کے افراد ہندوؤں کی خاص رسُوم اور طرزِ لباس۔ طرزِ رہائش نشست و برخاست۔ کھانا پینا وغیرہ کے پابند نہیں ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہندوؤں کا طرزِ تمدن قومی معیار نہیں ہے۔ اور نہ وہ قومی معیار قرار دیا جاتا یا قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہندو جماعت کے تمام افراد بھی کسی ایک طرزِ تمدن اور رہائش پر متفق نہیں ہیں مثلاً جنوبی

ہند کی برہمن عورتیں غیر برہمنوں کا سا لباس نہیں پہنتیں بلکہ ان کی گھریلو بولی ایسی ہے کہ اس کو سُن کر غیر برہمنوں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ ہندو دائرہ کے اندر ہر ذات اور فرقہ کی زبان طرزِ رہائش طرزِ تمدن وغیرہ میں اختلاف ہے۔ ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصص کے نوے فیصدی مسیحی وہی طرزِ تمدن رکھتے ہیں۔ جو اُن کے آبا و اجداد کا تھا۔ مسیحی ایمان ہندو دھرم یا اسلام کی طرح اپنے مقلدین کو کسی خاص لباس۔ کھانا پینا۔ نشست و برخاست۔ طرزِ رہائش وغیرہ کسی خارجی بات کی نسبت مجبور نہیں کرتا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ :-

کسی خاص قسم کا کھانا ہم کو خدا سے نہیں ملائے گا" (۱ کر ۸ : ۸) "خدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اُس خوشی پر موقوف ہے جو روح القدس کی طرف سے ہوتی ہے (روم ۱۴ : ۱۷، مرقس ۷ باب وغیرہ)

ہم اس نکتہ کو طول دینا نہیں چاہتے کیونکہ ہم اپنے رسالہ کلمۃ اللہ کی تعلیم میں اس بات پر مفصل بحث کرچکے ہیں۔ ہندوستانی مسیحی اپنی قوم کا غدار نہیں ہوتا۔ وہ صرف فرسودہ عقائد اور باطل اصُولوں کو ترک کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک کی سیاسی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو جاتا بلکہ چاہتا ہے کہ خداوند مسیح سے توفیق پاکر وہ ان کو کما حقہ سرانجام دے۔ وہ مسیحی عقائد کو قبول کرتا ہے لیکن مغربی خیالات کی کورانہ تقلید نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کلیسیائے جامع کا صحیح ایمان ہندوستانی

پیرایہ میں پیش کیا جائے تاکہ مسیحیت ہندوستان میں بدیشی خیالات کا مجموعہ نظر نہ آئے۔ وہ مسیحی ایمان کو مغربی فلسفہ اور خیالات کے عوارض سے جُدا کر کے ان کو مشرقی فلسفہ کے لباس میں مزین کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ کسی کو غیر مانوس معلوم نہ ہو۔ وہ اس بات کا بھی خواہاں نہیں کہ مغربی ممالک کی کلیساؤں کے مذہبی رسوم و رواج کو غلامانہ ذہنیت سے اختیار کر لے۔ اُس کو اس بات پر ناز ہے کہ ہندوستانی مسیحیوں کو خُدا نے ایک قومی وراثت بخشی ہے جو نہ ہندو ہے نہ مسلم بلکہ ہندوستانی وراثت ہے اور کہ مسیحی اس وراثت کے نگہبان اور مختار اور امین ہیں۔ پس وہ چاہتا ہے کہ وہ دیانتدار مختاروں کی طرح اس وراثت کی نگہداشت کر کے کلیسیائے جامع کی خاطر اس کا جائز استعمال کرے تاکہ بنی نوع انسان کی ترقی ہو۔ ہمارے غیر مسیحی برادران ابھی سیاسی امور میں سوراجیہ کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن ہندوستانی مسیحیوں نے مذہبی امور میں سوراج حاصل کر لیا ہوا ہے۔ چنانچہ کلیسیائے ہندوستان برما و لنکا کلیسیائے جامع کا ایک خود مختار حصہ ہے اور اس کا نصب العین یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں

پاک واحد اور رسولی کلیسیائے جامع کو اس طور سے پیش کریں کہ ہمارے ملک کے فرزند اس کلیسیا کو اپنا حقیقی رُوحانی گھر سمجھنے لگیں اور اپنے ہمراہ اپنی کلچر (ثقافت) کی دولت و اقتدار لے کر اس میں شامل ہوں۔ اس کلیسیا کے تمام بیٹیوں کی یہ دُعا ہے کہ یہ ملک خُدا کے جلال کے اس علم کی طرف رجوع کرے جس کا مظہر یسوع مسیح ہے۔ تاکہ ہندوستان جو اس کے فیض سے تا حال محروم ہے موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہو جائے" (ضابطہ ص۳۰۰)

ان روشن حقائق کے باوجود اخبار "انڈین سوشل ریفارمر" کے ہندو ایڈیٹر کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو وہ لکھتا ہے :-

"ہمارے دیس میں تبلیغی مشنوں کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک کی روایات اور زندگی اور کلچر کو تباہ کریں" - (۲۵۔ مئی ۱۹۴۷ء)

ع دراز دستیٔ ایں کوتاہ آستیناں بیں

ہندوستان کے مسیحی ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتے رہے ہیں کہ اگرچہ انہوں نے ہندو مت یا اسلام یا سکھ مذہب کو ترک کر دیا ہے تاہم وہ ہندوستانی قوم کے فرد ہیں۔ غیر مسیحیوں نے تو یہ خیال کر رکھا ہے کہ جب انسان اپنے مذہب کو ترک کرتا ہے تو وہ اپنی قوم کو بھی ترک کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان بہت سی اقوام پر مشتمل ہوگا۔ اسلامی قوم۔ ہندی قوم۔ سکھ قوم وغیرہ۔ مسلم لیگ کا جو سالانہ جلسہ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں ہُوا۔ اُس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک جُداگانہ قوم قرار دے دیا ہے۔ اور یہ اِس ذہنیت کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ جب ہندو اور مسلمان کسی شخص کو مذہب کے ترک کرنے پر اپنی ذات برادری خاندان، ملت اور قوم سے خارج کر دیتے ہیں تو وہ گویا تسلیم کر لیتے ہیں کہ اس ملک میں جتنے مذاہب ہیں اتنی ہی قومیں آباد ہیں اور کہ انسان اپنے مذہب کو ترک کرنے پر اپنی قوم کو بھی ترک کر دیتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسیحیوں نے اس قسم کے نظریہ کو کبھی قبول نہ کیا اور وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ہندوستانی کہلانا باعثِ فخر خیال کرتے رہے۔ ان کے نزدیک قوم ایک سیاسی تصور رہا ہے جس کا مذہب کی تبدیلی کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں۔ مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے تمدنی اور تعلیمی اور اقتصادی حالات

وروایات میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ اور ایک ہی نسل سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہندوستانی مسیحی صرف مذہبی آزادی چاہتے ہیں اور اس مطالبہ میں کوئی صاحبِ ہوش یہ نہیں کہیگا کہ وہ حق اور راستی پر نہیں ہیں۔ وہ جو قیصر کا ہے قیصر کو دینا چاہتے ہیں۔ اور جو خُدا کا ہے وہ خُدا کو دینا چاہتے ہیں۔ (متی ۲۲/۲۱ ۔ روم ۱۳/۶، ۷)

(۲)

ہندوستان کے مسیحی محبِ وطن ہیں۔ اور وہ یہ گوارا نہیں کرتے کہ کوئی گورنمنٹ مسیحیت کو اپنی سیاسی اغراض کی خاطر آلۂ کار بنالے اور لوگوں اور ملکوں کو اپنی ملوکیت کی خاطر غلامی کا طوق پہنلائے۔ مسیحیت ایک غالب اور فاتح مذہب ہے جس کا سیاسی غلبہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کسی دوسرے مُلک کی ملوکیت سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ مسیحی ملوکیت ادیانِ عالم پر حاوی ہے اور تمام ممالک وازمنہ کے افراد مسیح کے آگے سربسجود ہیں (افسی ۱/۲۱) بسا اوقات مسیح کی ملوکیت اور سیاسی ملوکیت میں تصادم واقع ہُوا۔ ہزاروں بادشاہوں نے مسیحیت کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہا۔ لیکن وہ ناکام رہے اور منجیٔ عالمین کی ملوکیت سب پر غالب آئی۔ پس گو ہندوستان کی مسیحی کلیسیا حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہے لیکن وطن پرست نہیں ہے کیونکہ وہ قوم اور وطن کی نہیں بلکہ خُدا کی پرستش کرتی ہے۔ حب الوطنی اور قوم پرستی یا وطنیت دو جُداگانہ باتیں ہیں۔ قوم پرست صرف اپنی قوم سے محبّت رکھتا ہے وہ غیروں سے محبّت نہیں رکھتا اس کی گردن صرف اس کی اپنی قوم کے آگے جُھکتی ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ اس کی قوم کی ہر چیز اور ہر بات اچھی ہے اور اس میں کچھ نقص

نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف اپنی قوم کی ترقی اور خوشحالی کا خواہاں ہوتا ہے۔ خواہ یہ دیگر اقوام کو پائمال کرنے سے حاصل ہو۔ دیگر اقوام کی ضروریاتِ زندگی سے اس کو مُطلق سروکار نہیں ہوتا۔ اس نصب العین کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم پرست کا ملک غالب اور زبردست ہوجاتا ہے اور دیگر اقوام وممالک مغلُوب اور زیردست ہوجاتے ہیں اور یہ صُلح کُش مقصد دُنیا کے جنگوں کے آغاز کا اصلی سبب ہوتا ہے۔ پس ہندوستانی مسیحی کلیسیا اس قسم کی وطنیت اور قوم پرستی کے تصوّر سے اتفاق نہیں کرسکتی۔ کیونکہ یہ طرزِ عمل بنی نوع انسان کی اُخوّت ومساوات اور محبّت کے منافی ہے۔ لیکن ہندوستان کی مسیحی کلیسیا محبِ وطن ہے۔ قوم پرستوں کی طرح مسیحی اپنے مادرِ وطن سے محبّت رکھتے ہیں لیکن وہ قوم پرستوں کی مانند غیروں سے نفرت وحقارت کا سلوک رکھنے کے روادار نہیں ہوسکتے۔ ہندوستانی مسیحی اپنے مُلک کی ہر شے کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھتے بلکہ اپنے مُلک کے عیوب ونقائص مثلاً چھوت چھات ذات پات کی تمیز عورتوں کی پست حالت۔ بے ہودہ روایات۔ اقتصادی اور سیاسی کمزوریوں وغیرہ سے بخُوبی واقف ہیں اور ہر ممکن طور پر جدوجہد کرتے ہیں کہ ہندوستان جنّت نشان کے چہرۂ زیبا سے یہ بدنُما داغ دور ہوجائیں۔ وہ اپنے مادرِ وطن پر نازاں ہیں لیکن بے جا فخر کرکے دیگر ممالک واقوام کی اچھی چیزوں کو پس پشت نہیں پھینکتے۔ ان کا نصب العین یہ نہیں کہ صرف ہندوستان ہی خوشحال اور ترقی پذیر ہو وہ دیگر ممالک واقوام کی ترقی کے بھی خواہاں ہیں۔ اور ان کے خیالات روایات اور ثقافت کو بھی قابلِ وقعت خیال کرتے ہیں اور ان کو بدیشی

قرار دے کر بغیر سوچے سمجھے رد نہیں کر دیتے۔ وہ ہندوستان کو بین الاقوامی خاندان اور نوعِ انسانی کا جزوِ لاینفک سمجھ کر ملکی ترقی کو سیم و زر کی محک پر نہیں بلکہ نیکی انصاف راستبازی اور محبت کے معیار سے پرکھتے ہیں۔ وہ خدا کی بادشاہی کو ہندوستان میں قائم کرنا موجب سعادتِ دارین خیال کرتے ہیں۔ آپ کا نجات دہندہ کُل دنیا کے ممالک و اقوام کو اور کُل بنی نوعِ انسان کو بچانے کے لئے آیا تھا۔ تاہم وہ اپنے وطن کو اس قدر پیار کرتا تھا کہ اس کی خاطر زار زار رویا تھا (لوقا ۱۹/۴۱۔ ۲۳/۲۸ ... ۱۳/۳۴-۳۵ وغیرہ) پس اس نمونہ کے مطابق تمام جہان کے مسیحیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے وطن سے محبت رکھیں۔ لیکن لازم ہے کہ ان کی محبت کسی ایک ملک، قوم یا طبقہ تک ہی محدود نہ ہو بلکہ ان کی محبت کا دائرہ اس قدر وسیع ہو کہ دوست اور دشمن اپنوں اور غیروں پر حاوی ہو (متی ۵/۴۸ وغیرہ) مسٹر گاندھی کے نظریہ وطنیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وطن کو مذہب پر مقدم رکھا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں لاہور کی کانگریس کے اجلاس میں پنڈال کے اوپر ایک جھنڈا نصب تھا جس پر لکھا تھا کہ ملک مقدم ہے اور مذہب مؤخر ہے۔ ہندو اپنے وطنیت کے عقیدہ کی وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم پہلے ہندوستانی ہیں بعد میں ہندو ہیں اور انہوں نے اس عقیدہ کو قوم پرستی کا لازمی جزو اور ظاہری نشان قرار دے دیا ہوا ہے۔ لیکن مسیحیت کی تعلیم اس کے برعکس ہے۔ اس کے عقائد ہمیں یہ سکھلاتے ہیں کہ مسیح کو وطن پر مقدم سمجھا جائے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی شخص سچا مسیحی نہیں ہو سکتا جب تک اس میں حب الوطنی نہ ہو کیونکہ مسیحیت زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ اس لئے وہ اوّل بھی

مسیحی ہے اور آخر بھی مسیحی ہے اور چونکہ اس کی ساری زندگی مسیح کی حکومت کے ماتحت ہے لہذا اس کی سیاسیات اس کے مذہب سے جدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن چونکہ اس کی سیاسیات خداوند مسیح کے ماتحت ہوں گی لہذا اس کی سیاسیات اس کے مذہب سے جدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن چونکہ اس کی سیاسیات خداوند مسیح کے ماتحت ہوں گی۔ لہذا اس کی حب الوطنی سے یہ لازم نہیں آئیگا کہ وہ دیگر اقوام و ممالک کو اپنے دائرۂ محبت سے خارج کر دے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ بین الاقوامی خیالات کو مسیحیت اور صرف مسیحیت ہی کی بدولت فروغ ہوا ہے۔ مسیحی مشنریوں کی طفیل اس قسم کے تعلقات ترقی پا گئے ہیں۔ مرحوم سی۔ ایف۔ اینڈ ر وز جیسے انسانوں نے مشرق و مغرب کو باہمی محبت کے بندھنوں میں جکڑ دیا ہے۔ مسیحی اصول ابوتِ الٰہی اور اخوت و مساواتِ انسانی کی وجہ سے ایشیا، افریقہ یورپ امریکہ وغیرہ مختلف براعظموں کے باشندے اپنے آپ کو بیش از بیش ایک ہی قسم کے انسان اور ایک ہی نوع کے فرد سمجھنے لگ گئے ہیں۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ مسیحیت کا تعلق کسی ایک قوم یا زمانہ یا ملک کے ساتھ نہیں ہے۔ کلمتہ اللہ ملک کنعان میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ لیکن آپ نے ایسی تعلیم اور اصول بتلائے جن کا اطلاق کُل بنی آدم پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو نام آپ نے اپنے لئے تجویز فرمایا وہ "ابن آدم" تھا۔ (متی ۱۶/۱۳ وغیرہ) پس اگر نوع انسانی ترقی کر رہی ہے تو صرف آپ کے اصولوں کی طفیل ترقی کر رہی ہے۔ اور اگر زمانہ مستقبل میں وہ ترقی کر سکتی ہے، تو صرف خداوند مسیح کے کلماتِ طیبات اور ارشادات پر گامزن ہو کر ہی ترقی کر سکتی ہے۔ نوعِ انسانی کا مستقبل منجی عالمین

کی ذات سے وابستہ ہے۔ کیا ہمارے ہم وطن اپنے قومی نسلی اور مذہبی تعصبات کو پسِ پشت پھینک کر اس پر ایمان نہ لائیں گے تاکہ ان کو سعادتِ دارین نصیب ہو؟

باب چہارم

سوودیشی مذہب کے اصول

سوامی دیانندجی اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں برہمو سماج کا کھنڈن کر کے فرماتے ہیں :-

"برہمو سماجیوں نے جو عیسائی مذہب میں شامل ہونے سے تھوڑے سے آدمیوں کو بچایا اور قدرے بُت پرستی دُور کی۔ یہ اُن کی باتیں اچھی ہیں۔ لیکن اُن میں حب الوطنی بہت کم ہے۔ اپنے مُلک کی تعریف اور اپنے بزرگوں کی عزت کرنی تو درکنار ان کی مذمت پیٹ بھر کر کرتے ہیں اور اپنی تقریروں میں عیسائی وغیرہ انگریزوں کی تعریف کرتے ہیں۔ برہما وغیرہ مہارشیوں کا نام بھی نہیں لیتے۔ ان کی کتاب میں عیسیٰ موسےٰ محمد۔ نانک اور چیتن کے نام لکھے ہیں۔ کسی رشی مہارشی کا نام بھی نہیں ہے۔ بھلا جب آریہ ورت میں پیدا ہوئے ہیں اور اسی ملک کا آب و دانہ کھاتے پیتے ہیں اور کھائیں پئیں گے۔ تو پھر ان کو اپنے باپ دادا کے طریق وغیرہ کو چھوڑ دوسروں کی طرف زیادہ راغب ہونا اپنے ملک کی زبان سنسکرت کے علم ادب سے بے بہرہ ہونا بنی نوع انسان کے لئے دائمی اور مفید کام کس طرح ہو سکتا ہے" (ستیارتھ پرکاش باب ۱۱)

اسی طرح رام کرشن پرم ہمس کہتے ہیں کہ تمام مذاہب برابر ہیں لیکن

ہندوؤں کے لئے "سناتن دھرم بہترین دھرم ہے۔کیونکہ وہ ہندوستان کے رشیوں کا دھرم ہے" ۔

مسٹر گاندھی کی تحریرات کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہندو مذہب کو اس واسطے مانتے ہیں کیونکہ آپ ہندو خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔اگر کسی شخص کے دل میں ہندو مذہب کے متعلق شکوک پیدا ہوئے ہوں تو مسٹر گاندھی اس کو یہ صلاح دیں گے۔ کہ تم اپنے ملک کے مذہب پر قائم رہو خواہ تم کو کوئی دوسرا مذہب اچھا معلوم ہو۔ یہ مذہب تمہارا آبائی مذہب ہے۔ اور اگر تم اس میں خرابیاں دیکھتے ہو تو ان خرابیوں کی اصلاح کر لو۔لیکن اس کو ترک مت کرو ۔

درحقیقت یہ امر گاندھی جی کے سودیشی اصول کا ایک نتیجہ ہے جس طرح وہ اپنے پیروؤں کو کہتے ہیں کہ اپنے ملک کی پیداوار پہ گذران کرو خواہ تم بیرون جات سے بہتر شے مہیا کر سکو اسی طرح وہ ہندو مذہب کو قبول کرتے ہیں اور جو باتیں اس میں اخلاق کے خلاف ہیں وہ ان کو رد کرتے ہیں۔اگر وہ کسی مسیحی ملک میں پیدا ہوتے تو وہ مسیحی ہوتے۔لیکن چونکہ وہ ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوئے ہیں اور ان کے ملک کا مذہب ہندو مذہب ہے لہٰذا وہ وطنیت کے اصول کی وجہ سے اپنے سودیشی مذہب کے قائل ہیں۔وہ اس واسطے ہندو نہیں کہ ان کے خیال میں ہندو مت درحقیقت بہترین مذہب ہے بلکہ وہ اس واسطے ہندو ہیں کیونکہ ہندو مت ہندوستان کا مذہب ہے۔ان کے لئے وطنیت کا سودیشی اصول ہند کی اقتصادیات اور سیاسیات اور مذہب سب پر حاوی ہے۔وہ جس طرح اقتصادیات اور سیاسیات

میں سودیشی اصول کے قائل ہیں۔اسی طرح وہ مذہبی امور میں سودیشی اصول پر ایمان رکھتے ہیں۔ان کے خیال کے مطابق ہر شخص کا اولین فرض یہی ہے کہ وہ باوجود اپنے آبائی مذہب کی بطالت کے اس پر قائم رہے اور اس کوشش میں رہے کہ اس کی خرابیوں کو حتے الوسع دور کرے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:۔

"ہر قوم اپنے ملک کے مذہب کو دیگر مذاہب کے برابر خیال کرتی ہے"۔

پھر کہتے ہیں:۔

"اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ ہندوستان کے لوگوں کے مذہب اس ملک کے لوگوں کے لئے کافی اور وافی ہیں... ہندوستانی کو اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک مذہب کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کرے... اگر مسیحی مشنری بنی نوع انسان کی بہبودی کے کام مثلاً سکول ہسپتال وغیرہ کا کام کرنے کی بجائے ہندوستان کے لوگوں کو مسیحیت کے حلقہ بگوش کرنا چاہتے ہیں تو بس ان سے یقینی طور پر یہی کہونگا کہ آپ ہمارے ملک سے رخصت ہو جائیں"۔کیا خوب!!

مسٹر گاندھی کے جانی دوست مرحوم مسٹر سی۔ایف۔اینڈروز کہتے ہیں کہ:۔

"مہاتما گاندھی راسخ الاعتقاد رجعت پسند ہندوؤں میں سے ہیں۔آپ میں روحانی آزادی کا احساس زبردست ہے اور آپ کے دل میں ہندو مذہب کی اصلاح کا خیال جاگزیں ہے۔سودیشی آپ کا مذہبی اصول ہے۔ اور اس اصول کی وجہ سے وہ اپنا آبائی مذہب ترک کر کے کسی بدیشی مذہب کو قبول کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے" ۔

(۲)

ہمارے قوم پرست نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ہر قسم کے مذہب کے خلاف ہے۔ ہم سطور بالا میں ذکر کر چکے ہیں کہ وہ مروّجہ مذاہب سے بیزار ہیں۔ لیکن چونکہ کسی بالا ہستی کو ماننا انسانی فطرت میں داخل ہے لہذا ایسے وطن پرستوں کے فطرتی تقاضا کو پورا کرنے کے لئے ان کے لئے ایک نیا مذہب تجویز کیا گیا ہے یعنی بنارس میں ایک مندر بنایا گیا ہے۔ جس میں ہندوستان کا ایک بڑا نقشہ رکھ دیا گیا ہے اور وہاں اس مندر میں بھارت ماتا کی پرستش کی جاتی ہے۔ مدیش بھگتی کے مہاتما مسٹر گاندھی نے سنہ ۱۹۳۶ء میں دسہرے کے دن اس مندر کی افتتاحی رسم کو ادا کیا تھا۔ اور اس قسم کی پرستش کی تعریف میں چند کلمات بھی فرمائے تھے۔ ہم نے یہ اخبارات میں پڑھا ہوا تھا کہ ہٹلر کے زیر اثر جرمنی کے لوگ مسیحی اصول اخوت انسانی کو ترک کر کے ایک ایسا مذہب اختیار کر رہے ہیں جس میں جرمنی کے قدیم دیوتاؤں کی عظمت۔ غیر جرمن لوگوں اور مذہبوں سے نفرت اور آرین نسل کے آدمیوں میں اُخوّت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب ہم نے خود ہندوستان میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا ہے۔ کہ مہاتما جی ہندوستانیوں کے لئے ایک ایسے مذہب کی بُنیاد قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہندوؤں کے قدیم دیوتاؤں کو عظمت دینے کی۔ غیر ہندی اصُول کو ترک کرنے کی اور آرین نسل کے سودیشی آدمیوں میں اُخوت کی تعلیم دی جائے تاکہ ہندوستان کے باہر کے مذاہب اور اُن کے پیروؤں کو بدیشی قرار دے کر ان کو اپنے اقتصادی اور سیاسی غلبہ سے خاموش کر دیا جائے۔ ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان اور ہندوستانی

قوم کے حق میں یہ نئے معبود اور دیوتا اُن کے پُرانے معبودوں اور قدیم دیوتاؤں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔ ہمیں جرمنی سے اس معاملہ میں سبق حاصل کرنا چاہئے اور عبرت پکڑنی چاہئے تاکہ ہمارے ملک اور قوم میں اس قسم کے زہریلے جراثیم نہ پھیل جائیں جس کا نتیجہ خانہ جنگی تباہی اور بربادی ہوتی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم میں یگانگت اور اتحاد پیدا ہو تو ہم کو اس قسم کے مذہب کو اختراع کرنے اور تقویت دینے اور اس کا پرچار کرنے سے محترز رہنا چاہئے۔ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے   جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

(۳)

مذہب کے امُور میں وطنیت اور سودیشی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مذہب تو یک طرف دنیاداری کے معاملات سودیشی کے اصُول پر نہیں چل سکتے۔ جو شخص اقتصادیات پر غور کرنے کی زحمت اُٹھاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی قوم اقتصادی طور پر ترقی نہیں کر سکتی جو سودیشی کے اصول پر عمل کر کے اپنے آپ کو اقوام عالم سے الگ کر لیتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کو مدِ نظر رکھ کر سودیشی کا اصُول تھوڑی مدت کے لئے کارآمد ہو لیکن اگر یہ اصُول ہمیشہ کے لئے ہندوستان پر عائد کیا جائیگا تو ہمارے ملک کے لئے تنزّلی کا باعث ہوگا۔ جہاں تک سیاسیات اور اقتصادیات کا تعلق ہے دُنیا کے ممالک سودیشی کے اصُول کو ترک کر رہے ہیں تاکہ وہ ترقی کر سکیں جس طرح انہوں نے علم اور سائنس میں سودیشی کے اصُول کو ترک کر دیا ہے۔ علم اور سائنس کے نظریئے خواہ ان کی ابتداء کسی مُلک یا قوم سے ہوئی ہو دُنیا کے ہر گوشہ میں اور ہندوستان کے ہر کونے میں حق اور درست

ماننے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کے دریا کی موجوں کو مسٹر گاندھی
اپنے مُنہ کے الفاظ سے روک نہیں سکتے۔ یہ دریا تمام مصنوعی رُکاوٹوں کو
اپنے آگے بہائے جاتا ہے۔ اس کی ٹکریں تمام قومی دیواروں کو گرا دیتی
ہیں۔ اور سودیشی اصول خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جاتے ہیں۔
خُدا جو کل بنی نوع انسان کا خالق اور باپ ہے چاہتا ہے کہ اس کے بیٹے
ایک خاندان کے ممبر اور ایک بدن کے اعضا ہو کر اس دُنیا میں زندگی بسر
کریں ۔

(۴)

جس شخص نے مسیحیت کا سطحی مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ اس پر یہ واضح
ہو گیا ہوگا۔ کہ مسیحیت ان خیالات کی ابتدا ہی سے مخالف رہی ہے مثلاً بالا
آبائے کلیسیا میں سے کلیمنٹ اور اوریجن دونوں مسٹر گاندھی کے مندرجہ
خیال کی رد میں کہتے ہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی شخص کو اپنے باپ دادا کا مذہب
ترک نہیں کرنا چاہئے تب ہی درست ہو سکتا ہے اگر وہ مذہب درست
اور صحیح ہے۔ کسی مذہب کی حقانیت کا ثبوت یہ نہیں کہ یہ دین ہمارے
باپ دادا کا دین ہے بلکہ یہ کہ وہ حق ہے۔ اگر کوئی مذہب حق پر نہیں تو
یہ خیال کہ وہ ہمارا آبائی مذہب ہے اس کے ترک کرنے میں سدِ راہ
نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے باپ دادا کا خیال تھا کہ وہ مذہب حق پر ہے
لہٰذا وہ اُس کو مانتے بھی تھے لیکن اگر ہم اس مذہب کو باطل جانتے ہیں اور
ترک نہیں کرتے تو ہم اپنے باپ دادا کے اصُول پر نہیں چلتے۔ اوریجن
نہایت پُر زور الفاظ میں کہتا ہے کہ مختلف مذاہب میں جو فرق ہے وہ
نہایت اہم ہے اور لازم ہے کہ ہم تمام انسانی روایات اور دستورات

کو ترک کر کے حق کی پیروی کریں۔

(۵)

مسٹر گاندھی اور ان کے ہم خیال ہندو لیڈر اپنے خود ساختہ وطنیت
اور سودیشی کے اصُول کی وجہ سے مجبور ہیں کہ وہ ہندو مت کے نقائص
کے باوجود اس کی پیروی کریں۔ لیکن کیا یہ طریقۂ کار ان کے اصُول کے
مطابق ہے جس پر وہ ناز کرتے ہیں کہ میں ہمیشہ حق کی پیروی کرنا چاہتا
ہوں ؟

علاوہ ازیں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ تُم ہندو مذہب میں جو نقائص
اور خرابیاں ہیں ان کو دُور کرو تو وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اُن
کے آبائی مذہب کے نقایص کسی بہتر مذہب کے اصُول کی روشنی میں
ہی نظر آ سکتے ہیں۔ مثلاً ہندو مذہب میں اچھُوت کا نقص موجود
ہے۔ اس نقص کو مسٹر گاندھی ایک بدنما داغ مانتے ہیں۔ لیکن یہ نقص
مسیحیت کے اصُول کی روشنی میں ہی نقص نظر آنے لگا ہے۔ ورنہ
ہزارہا سال سے یہ ہندو مت کی ایک خُوبی تصور کی جاتی تھی۔ لیکن جہاں
"بہتر" ہے۔ وہاں لازم ہے کہ اس سے کم درجہ کی شے موجود ہو۔ "جب
کامل آئیگا تو ناقص جاتا رہے گا" (۱کر ۱۳: ۱۰) اس صورت میں مسٹر
گاندھی کا یہ خیال باطل ہوگا کہ تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح اور درست
ہیں۔ مختلف مذاہب علی الترتیب اپنے اپنے اصولوں کی خوبیوں اور
خرابیوں کی بناء پر تقسیم کئے جائیں گے۔ جس مذہب میں زیادہ خرابیاں
ہوں گی اُس مذہب کا پایہ کم ہوگا اور جتنی خرابیاں زیادہ ہوں گی اتنا ہی
اس کا پایہ کم ہوگا۔ اور جس مذہب میں خُوبیاں زیادہ ہوں گی اس

مذہب کا پایہ بڑا ہوگا۔ اور جتنی خوبیاں زیادہ ہونگی اس کا پایہ اتنا ہی بڑا ہوگا۔ اور عالمگیر مذہب وہ ہوگا جس میں خدا کا تصور نہایت صاف اور واضح طور پر اعلیٰ ترین اخلاقی سطح نظر پر مبنی ہوگا۔ اور جس میں اخلاقیات کا تصور اعلیٰ ترین حالت میں موجود ہوگا۔ دریں حال تمام مذاہب یکساں طور پر کس طرح صحیح اور درست ہوں گے؟

(۶)

چونکہ ہمارے ملک میں قومیت اور وطن پرستی کا جذبہ غالب ہے لہذا ہمارے ہندوستانی بھائی گاندھی جی کی تقلید میں چاہتے ہیں کہ وہ کسی بدیشی مذہب کے بانی کو خدا کا اعلیٰ ترین مظہر ماننے کی بجائے اپنے دیس کے کسی ہیرو کو مانیں۔ پس ہندوستان کی نئی پود نے کرشن مہاراج کو خداوند مسیح کی بجائے خدا کا اوتار مان لیا ہے۔

یہ امر بہت اشخاص کے لئے حیرانی کا موجب ہے کہ جس ملک میں اہمسہ کی تعلیم عام ہے اور مہاتما گاندھی جیسے ستیا گراہی پیدا کرتا ہے۔ اس کے باشندے کرشن مہاراج کو جو جنگجو سپاہی تھے اپنا قومی ہیرو کس طرح مان سکتے ہیں اور گیتا کو جو جنگ و قتل کا سبق پڑھاتی ہے اپنی مذہبی کتاب کس طرح قبول کر سکتے ہیں؟ ہندوستان کو قدیم برہمنوں کے علم اور فلاسفروں کی ودیا پر ناز ہے۔ لیکن ہمارے ہندو نوجوان ان میں کسی کو اپنا قومی ہیرو نہیں مانتے۔ ہمارے رسالہ نور الہدیٰ کے حصہ اول سے ناظرین پر یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ بت پرست مذاہب اور بت پرست ممالک کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کسی قومی ہیرو کو دیوتاؤں کی صفات سے متصف کر دیتے ہیں۔ یہی حال کرشن مہاراج کے ساتھ کیا گیا ہے۔ آپ ہندوؤں کے

قومی ہیرو تھے اور اب اوتار ہیں۔ ان کے اوتار ہونے کا نظریہ اہل ہنود کے مذہب کا جزو نہیں بلکہ وہ ایک ثقافتی پہلو رکھتا ہے۔ لہذا وطنیت کے لئے اہم ہو گیا ہے۔ چونکہ غیر ہنود نے کرشن پر بطور ایک اوتار کے حملے کئے ہیں لہذا قومی خودداری اور وقار کو قائم رکھنے کے لئے کرشن کے اوتار ہونے کی حیثیت کی اہمیت روز افزوں کرتی گئی ہے حتیٰ کہ دورِ حاضر میں بندابن کا خوش گلو لڑکا اور کوروکشتر کے میدان کا سپاہی اب اہل ہنود کے دلوں میں گھر کر گیا ہے۔ اور وہ "غریبوں کا دوست" "مصیبت زدوں کا حامی اور گرے ہوؤں کا نجات دینے والا" بن گیا ہے۔ پس جس نسبت سے ہمارے نوجوان ہندو مذہب کے اصول و رسوم کو ترک کر بیٹھے ہیں اسی نسبت سے وہ کرشن کو اپنا قومی ہیرو اور خدا کا اوتار سمجھتے ہیں۔ بقول شخصے۔

پیرِ من خس است و اعتقادِ من بس است

وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ انسانی فطرت ہر ملک و قوم میں ایک ہی ہے۔ ملک اور قوم ذات اور نسل کی امتیازات محض عارضی اور سطحی ہیں۔ لیکن سرشتِ انسانی ہر زمانہ قوم ملک اور نسل میں ایک ہی ہے۔ پس اہم سوال یہ نہیں کہ خدا نے کس قوم یا ملک میں اوتار لیا ہے کیونکہ خدا کے تجسم کا بیرونی حالات سے کسی قسم کا واسطہ نہیں۔ خواہ وہ حالات آرین نسل سے متعلق ہوں اور خواہ شامی نسل سے اور خواہ منگولی نسل سے متعلق ہوں۔ ہماری غرض اوتار کے اندرونی حالات سے ہے۔ لازم یہ ہے کہ جو خدا کا اوتار ہو وہ نوع انسانی کے لئے ایک کامل اور اکمل اور خوبصورت ترین نمونہ ہو۔ اور اس کے کیریکٹر کی خوبصورتی اپنے روحانی کمال کی وجہ سے ہمارے دلوں کو متاثر کرے۔ اور ہر ملک و

قوم کا انسان اس نمونہ کو دیکھ کر پہچان جائے کہ فی الحقیقت وہ خُدا کا کامل مظہر ہے +

حق تو یہ ہے کہ انسانی نیکی کسی خاص ملک یا آب و ہوا میں نہیں پھلتی پھولتی بلکہ ہر ملک و قوم و نسل میں پھل پھُول سکتی ہے یہ بات غلط ہے کہ ایشیا میں ایک خاص قسم کی نیکی ہوتی ہے۔ افریقہ میں دوسری قسم کی اور یورپ میں تیسری قسم کی نیکی ہوتی ہے۔ ہر ملک و قوم کی مقدس ہستی بحیثیت انسان ہونے کے باقی اقوام و ممالک کے لئے قابل تعریف اور قابلِ تقلید ہوتی ہے۔ کرشن مہاراج کا جو کیریکٹر ہم کو پرانوں اور تنتروں میں دکھایا جاتا ہے وہ قابل تعریف و تقلید نہیں ہے۔ لیکن اس کے برعکس مسیح کا کیریکٹر اپنے اوج اور دلفریبی کی وجہ سے ہر ملک و قوم و نسل کے انسانوں کا نصب العین ہو گیا ہے۔ مشرق و مغرب۔ ہندوستان چین و جاپان۔ افریقہ اور امریکہ کے باشندے سب قائل ہیں کہ اگر خُدا کا تجسم ممکن ہو سکتا ہے تو وہ خُداوند مسیح میں مجسم ہُوا ہے۔ جس طرح دُنیا کے تمام ممالک میں آفتاب کی روشنی یکساں ہے اور ہر ملک و قوم و نسل کا شخص جو اندھا نہیں وہ روشنی کو جانتا اور محسوس کرتا ہے اُسی طرح ہر ملک و قوم و زمانہ اور نسل کے انسان مسیح کو خُدا کا کامل مظہر جان سکتے ہیں۔ لیکن کُل دُنیا کے انسان تو یک جا رہے خود ہندوستان کے باشندے کرشن مہاراج کو اوتار نہیں مانتے۔ ہر صاحبِ عقل جانتا ہے کہ دونوں اوتاروں میں بعد المشرقین ہے۔ کرشن مہاراج کا اوتار ہونا ہمارے ابنائے وطن کی قوّتِ متخیلہ پر انحصار رکھتا ہے۔ ہندو وطن پرست کہتے ہیں :-

۵ فسانے اپنی محبّت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لئے

خُداوند مسیح کا اوتار اور مجسّم خُدا ہونا آنخداوند کی ذات و صفات کی تواریخی حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے۔ قوّتِ متخیلہ کی بناء ریت کی طرح ہے جس پر اگر کوئی عالیشان عمارت کھڑی کر دی جائے تو جب شک و شبہ کے طوفان اُٹھتے ہیں اور عقلی اور منقولی دلائل کی آندھیاں چلتی ہیں اور اس عمارت پر ٹکریں لگتی ہیں تو اس عمارت کو صدمہ پہنچتا ہے اور وہ گر کر برباد ہو جاتی ہے۔ لیکن تواریخی حقیقت کی بناء چٹان کی طرح ہے جس پر اگر کوئی عالیشان عمارت قائم کر دی جائے تو اس کو کبھی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ پس جتنا ایک واضح تاریخی حقیقت اور محض تخیّل میں فرق ہے اتنا ہی خُداوند مسیح اور کرشن مہاراج میں فرق ہے +

ہم اس بات کو ایک موٹی مثال سے واضح کر دیتے ہیں۔ جب ہمارے ابنائے وطن نے دیکھا کہ مسٹر گاندھی اپنے نصب العین اور مقصد کو پُورا کرنے کے لئے ہر طرح کا دُکھ اور اذیت برداشت کرنے اور جسمانی قربانی کرنے کو نہایت خوشی اور رضامندی کے ساتھ تیار ہیں اور اپنے دُشمنوں کے ساتھ محبت اور عدم تشدّد کی تعلیم دیتے ہیں۔ تو وہ فوراً بول اُٹھے کہ گاندھی جی اس زمانہ کے مسیح ہیں۔ اُنہوں نے آپ کے اقوال اور افعال کی نظیر کرشن مہاراج یا ہندوستان کے غیر مسیحی مذاہب کے کسی ہیرو میں نہ دیکھی۔ بلکہ خُداوند مسیح کی تعلیم۔ نمونہ۔ اذیت۔ قربانی۔ ایثار اور صلیب میں ہی دیکھی۔ ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی کے مقدمہ اور سزا کا مقابلہ تمام مسیحی اور غیر مسیحی اخباروں میں خُداوند مسیح کے مقدمہ کے ساتھ کیا گیا۔ ۱۹۲۳ء

کی سالانہ انڈین نیشنل کانگرس کے پریزیڈنٹ مرحوم سی۔آر۔داس نے اپنے خطبہ میں انجیل متی کے آخری ابواب میں سے بہت سے اقتباسات پیش کئے۔اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں انسان مسٹر گاندھی کی عزت کرتے ہیں۔لیکن اس عزت کا اظہار کرتے وقت ہمارے ابنائے وطن گاندھی جی کو حضرت محمدؐ یا کرشن مہاراج یا بدھ مہاراج کی مانند قرار نہیں دیتے بلکہ خداوند مسیح کی مانند قرار دیتے ہیں۔اگر رام یا کرشن وغیرہ میں اور مسیح میں درحقیقت فرق نہیں تو وہ کیوں نہیں کہتے کہ مہاتما جی رام یا کرشن وغیرہم کی مانند ہیں؟ وہ اپنے دلوں میں اس بات کے قائل ہیں کہ گاندھی جی کو ان کی مانند قرار دینا درحقیقت گاندھی جی کی بے عزتی کرنا ہے۔اسی طرح جب پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۳۷ء میں لاہور تشریف لائے تو لاہور کے نوجوان قوم پرستوں نے آپ کو ۱۰ جنوری کے روز کانٹوں کا تاج پیشکش کیا۔جو آپ نے بڑی انکساری سے قبول بھی کیا۔جس سے ظاہر ہے کہ کانٹوں کا تاج پیش کرنے والوں کے دلوں میں یہ احساس تھا کہ خداوند مسیح کی زندگی ہماری قوم کے مایۂ ناز رہبر کے لئے ایک نمونہ ہے۔اس طرزِ عمل سے ہمارے کروڑوں ہم وطن اقرار کرتے ہیں کہ خداوند مسیح کی شخصیت ہندو دھرم اور دیگر غیر مسیحی مذاہب کے دیوتاؤں اور بانیوں سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند کی ذات قدسی صفات ایک حقیقت پر مبنی ہے۔اور آپ تمام دنیا کے مطمحِ نظر ہیں۔لیکن دیگر بانیان مذہب کی شخصیتیں انسان کی قوتِ متخیلہ کی دست نگر ہیں۔دیگر حضرات کی ہستیاں انسانی قوتِ متخیلہ کی طرف دیکھتی ہیں۔لیکن انسانی قوتِ متخیلہ خداوند مسیح کی ہستی کی طرف

دیکھتی ہے تاکہ پرواز کر سکے ؎

ہم خوبانِ عالم را بزیورہا بیارایند — تو سیمین تن ہستی کہ زیور را بیارائی

(۷)

علاوہ ازیں سودیشی مذہب کے شیدائیوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ:۔

ع بنی آدم اعضائے یکدیگر اند

مختلف اقوام کے اختلافات عارضی ہیں اور ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔کالے اور گورے چینی اور جاپانی۔امریکی اور افریقی۔عجمی اور عربی وغیرہ وغیرہ تمام اقوام نوعِ انسانی کی مختلف شاخیں ہیں۔یہ محض ایک اتفاق ہے کہ وہ مختلف مقامات میں آباد ہیں۔ان کے قومی اختلافات محض عارضی اور سطحی اختلافات ہیں۔ہر شخص کی سرشت انسانی ہے اور انسانی فطرت ہر جگہ ایک ہی ہے۔اس کی روحانی ضروریات ہر ملک زمانہ اور قوم میں ایک ہی ہیں۔مذہب کے معاملہ میں جائے پیدائش اور جنم بھومی کو دخل نہیں بلکہ نئی پیدائش اور نئے جنم کو دخل ہے۔انسان کے بے لگام ارادے۔بری خواہشات۔گناہ روحانی موت وغیرہ کسی ایک قوم یا ملک سے مخصوص نہیں بلکہ گناہ ایک عالمگیر بیماری ہے جس کا علاج بھی عالمگیر ہے۔

ہم ہندوستان کے اہلِ ہنود سے پوچھتے ہیں کہ اگر ہر ملک کا مذہب اس ملک کے باشندوں کے لئے کافی اور وافی ہے تو تم امریکہ اور یورپ میں لوگوں کو کیوں بھیجتے ہو تاکہ وہاں رام کرشن اور ویدانت کے خیالات کا پرچار کریں اور وہاں کے لوگوں کو کیوں ہندو طریقۂ خوراک بود و باش وغیرہ پر راغب کر کے ان کے آبائی مذہب سے ان کو روگردان کرتے ہو چنانچہ سری شنکر اچاریہ ڈاکٹر کرت کوٹی نے لاہور میں اکتوبر ۱۹۳

کے ہندو مہاسبھا کے سالانہ جلسہ کے خطبہ صدارت کے دوران میں فخریہ کہا تھا:-

"میں نے گزشتہ سالوں کے دوران میں چند انگریز فرانسیسی اور امریکن خواتین کو ہندو مت میں شامل کیا ہے اور میں خوشی سے یہ کہتا ہوں کہ وہ ہندوستان کی ہندو عورتوں سے کسی بات میں پیچھے نہیں ہیں" ٭

؎ آگیا داغ ان کے دل میں عرو جو   شکل ہے دُنیا میں لاثانی میری

پس ہم سودیشی کے اصُول کو روحانی اُمور پر عائد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انسانی روح کے میلانات اور رحجانات زمان و مکان یا ملک اور قوم کی قیود میں جکڑے نہیں ہوتے۔ ہندوستانیوں کی روحوں کے تقاضے بعینہ وہی ہیں جو دیگر ممالک کے باشندوں کی روحوں کے تقاضے ہیں۔ مذہب جغرافیہ کی حدُود کی چار دیواری میں مقیّد نہیں ہوتا۔ اس کا دائرۂ اثر اس قسم کی مصنُوعی زنجیروں کا پابند نہیں ہوتا۔ لفظ سودیشی مذہب محض بے معنی ہے۔ کیونکہ مذہب کا تعلق انسانی سرشت اور انسانی فطرت کے ساتھ ہے جس کی ضروریات ہر ملک تمام قوم و ملت میں ایک ہی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی روحانی اصُول ایسا ہے جو انسانی فطرت کے تقاضاؤں کو بدرجۂ غایت پُورا کرتا ہے اور وہ ہمارے مُلک کا نہیں ہے تو کسی صاحبِ عقل کا یہ کام نہیں کہ ایسے گراںمایہ دُرِ نایاب کو محض سودیشی اصولِ وطنیت کی خاطر پھینک دے اور اپنے ابنائے وطن کو اس کے فیوض سے محرُوم کر دے۔ ایسے طریقۂ کار سے ہم ہندوستان پر روحانی ترقی کا دروازہ بند کر دینگے ٭

(۸)

بعض برادران وطن اپنے خود ساختہ اصول رواداری کے اس قدر شیدائی ہو جاتے ہیں کہ جس چیز کو وہ اپنے دلوں میں مکروہ اور غلط جانتے ہیں اس کی حمایت میں عام پبلک کے روبرُو رطب اللسان ہو جاتے ہیں اور اپنی ضمیر کو یہ سمجھا کر خاموش کر دیتے ہیں کہ وہ مکروہ بات اُن کی روایات کا جزُو ہے۔ مثلاً تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسان بُت پرستی کو باطل اور مردُود خیال کرتے ہیں۔ لیکن جب کبھی پبلک کے سامنے اس کا ذکر ہوتا ہے تو وہ بے سروپا تاویلیں کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ جب وہ اپنے گاؤں میں جاتے ہیں تو بُت پرستی اور دیگر واہیات رسُوم میں شریک ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ دل میں اُن کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں۔ لیکن اپنی ضمیر کو یہ کہہ کر خاموش کر دیتے ہیں کہ یہ رسُومِ بد اُن کے آباؤ اجداد کی قومی روایات کا جزو لاینفک ہیں۔ لہٰذا ان میں شریک ہونا ہرج کی بات نہیں۔ ان کا یہ معیار ہے کہ ؎

ع   بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو

لیکن یہ معیار سراسر غلط ہے۔ گو یہ معیار بھاگوت گیتا کا ہے چنانچہ کرشن جی کہتے ہیں:-

"جس راہ پر بزرگ چلیں اور جو دستور وہ بنائیں۔ عوام کو لازم ہے کہ وہ اسی کے پابند ہوں"۔ (۳۲۱)

یہ تعلیم یافتہ اشخاص یہ خیال نہیں کرتے کہ بقول مرحوم لارڈ مارلے اس قسم کے منافقانہ رویّہ سے وہ اپنے ملّی اور جماعتی رسُوم کی اصلاح

اور ملک کی حقیقی فلاح کا دروازہ بند کر دیتے ہیں +

(۹)

دورِ حاضر کی نوجوان پشت قوم کی خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتی ہے۔ لیکن جونہی وہ اصلاح کرنی چاہتے ہیں ہندو مت اُن کی مساعیٔ جمیلہ میں سنگِ گراں ہو کر سدِّ راہ ہو جاتا ہے۔ پس قوم کے مصلحین کے لئے لازم تو یہ ہے کہ وہ ہندو مت کو راستہ میں سے ہٹا دیں تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں۔ لیکن اس کے برعکس ان کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ہندو مت ہمارے رشیوں کا مذہب ہے وہ ہمارا آبائی مذہب ہے۔ وطن کے سودیشی مذہب کو ترک نہ کرو۔ مثلاً اچھوت اُدھار کا سوال لے لو۔ جب سے برطانیہ نے فرقہ دارانہ فیصلہ میں اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ شمار کیا ہے تب سے مسٹر گاندھی اور ان کے رفقا اس فکر میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اچھوت ہندوؤں سے الگ نہ ہوں تاکہ ہندوؤں کو ضعف نہ پہنچے۔ پس انہوں نے اچھوت ذاتوں کو اُٹھانے کا پراپیگنڈا کیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سب سے بڑی شے جو اچھوت ادھار کی راہ میں حائل ہے وہ ہندوؤں کا کرم کا اصول ہے۔ جب تک یہ اصول ہندوستان میں مانا جائیگا اچھوت ادھار کی تمام کوششیں بے سود اور بے کار ثابت ہوں گی۔ کیونکہ ان دونوں میں علّت و معلول کا تعلق ہے۔ پس اگر ہم اچھوت ذاتوں کو اُٹھانا چاہتے ہیں تو ہمیں لازمی طور پر کرم کے اصول کو ترک کرنا ہوگا جس طرح ہندوستان کے مسیحیوں نے ترک کر کے ان نیچ ذاتوں کو اوپر اٹھایا ہے۔ لیکن جائے حیرت یہ ہے کہ مسٹر گاندھی مسیحی کلیسیا کو اس کارِ خیر کے لئے کوستے

ہیں اور مسیحی مبلّغین کو ملک بدر کرنے کی دھمکیاں دیتے ہیں حالانکہ قوم کی شیرازہ بندی صرف مسیحی اصول پر عمل کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔

(۱۰)

ہم کو یہ امر ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وطنیت اور سودیشی کا اصول جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے تو منافرت اور مناقشت کا پودا پھلنے پھولنے لگتا ہے۔ اس قسم کے اصول کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے ملک وطن اور قوم کی اس قدر پرستش کرنے لگ جاتے ہیں کہ دیگر ممالک و اقوام کے انسانوں اور چیزوں کو "بدیشی" سمجھ کر ان کو حقارت اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ بعض اوقات مجنونانہ جوش میں قوم پرست نوجوان دوسروں کی جان لینا بھی فرض سمجھ کر اُن کو بے دریغ قتل کر دیتے ہیں۔ اور اپنی جان کو قومیت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانا اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ قتل اور خون ان کی نگاہ میں ایک مقدس فرض نظر آتا ہے۔ اور دیگر وطن پرست قاتل کو غازی اور شہید کے معزز القاب سے ملقب کرتے ہیں۔ خود ہمارے ملک میں بیسویں صدی کے اوائل میں قومیت اور وطن پرستی کے جذبہ سے سرشار ہو کر نوجوان دوسروں کو قتل کرتے رہے۔ کیونکہ دوسرے ان کے فعل کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔ ابھی چند سال ہوئے آہنسہ اور عدم تشدد کے رسول مسٹر گاندھی قاتل بھگت سنگھ کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اگرچہ وہ اس کے فعل کو بُرا سمجھتے تھے۔

مملکت را دین او معبود ساخت   فکر او مذموم را محمود ساخت

یہ سچ ہے کہ گاندھی جی عدم تشدد کی تلقین کرتے ہیں اور اس

اصول پر خود عمل کرتے ہیں۔ لیکن عدم تشدد کا اصول قومیت کے مذہب یا وطنیت کا اصل الاصول نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک خارجی اصول ہے جو غیر ہندو مذاہب بالخصوص مسیحیت سے (جس کا وطن پرستی سے تعلق نہیں) اخذ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم پرست بالعموم اس اصول کو وطنیت کے مذہب کی بنیاد نہیں مانتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وطنیت کے مذہب میں وہ اخلاقی طاقت موجود نہیں جو تشدد کو ایک مذموم شے قرار دینے پر اصرار کرے۔ اور یہ خدشہ رہتا ہے کہ وطنیت کا مذہب ہماری انسانی سرشت کے میلانات اور رجحانات کو سیدھے رستہ پر رکھنے کی بجائے ان کو برگشتہ کر دیگا اور ملک و قوم کو سدھارنے کی بجائے ان کو بگاڑ دیگا۔ موجودہ زمانہ میں قومیت سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ قوم ایک وجودِ مطلق ہے اور تمام چیزیں اس کے ماتحت ہیں۔ یہ تعلیم نئے بھیس میں وہی پرانی تعلیم ہے جس کا مقابلہ مسیحیت نے اوائل صدیوں میں کیا تھا کہ قیصر خدا ہے۔ اس نئی تعلیم کا یہ مطلب ہے کہ وطن کی سیاسیات انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حکمران ہے اور الٰہی شرائع اور مذہبی احکام سب اس کے ماتحت ہیں۔ یہ عہد حاضر کا دجال ہے اور بت پرستی کے برابر ہے۔ کیونکہ اس طور پر قوم خدا کی سلطنت سے بالا اور خالق کی مرضی ارادہ اور منشاء پر مقدم قرار دی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ فی زمانہ جس ملک (مثلاً جرمنی۔ اٹلی وغیرہ) میں یہ تعلیم غالب ہوتی ہے وہاں نہ صرف مذہبی آزادی بلکہ ہر قسم کی آزادی نابود ہو جاتی ہے۔ وطنیت اور قومیت خدا کی برتری اور اس کے قوانین کی عالمگیری کا انکار کرتی ہے تاکہ خدا کی جگہ کو غصب کر کے اپنے قوانین کو انسانوں پر حاوی کر سکے۔

وطنیت کے اصول قومیت کو خدا اور مذہب پر حکمران کر دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں مذہب کو قومیت پر حکمران ہونا چاہئے۔ تاکہ مذہب قوم کی حالت کو سدھار سکے اور قوم شاہرہ ترقی پر گامزن ہو سکے۔

— ۱۱ —

اگر سودیشی اصول کا مذہب پر اطلاق کیا جائے تو اس کا لازم طور پر منطقی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ سودیشی مذہب یا وطنیت کے ماننے والے اس بات کے قائل نہیں کہ کل بنی آدم ایک ہی اصل او خون سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے اسی قسم کا تعلق رکھتے ہیں جو مختلف اعضا کو ایک ہی بدن سے ہوتا ہے۔ اِس مسلمہ اصول کا انکار لازمی ہے کہ ع بنی آدم اعضائے یک دیگر
مرحوم اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ:-

آنچناں قطعِ اخوت کردہ اند — بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند — نوعِ انساں را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد

چونکہ اس نظریہ کی رو سے قوم کی بنیاد وطن ہے۔ لہٰذا ہم کو یہ ماننا پڑیگا کہ رنگ نسل قوم اور ذات و ملک کے اختلافات سطحی اور عارضی نہیں۔ بلکہ اصلی حقیقی اور بنیادی اختلافات ہیں۔ لیکن فی زمانہ کون صحیح العقل شخص اس قسم کے نتیجہ کو مان سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ منطقی نتیجہ عقل کے خلاف ہے لہٰذا باطل ہے۔ پس نتیجہ کی بطالت ثابت کرتی ہے کہ وہ قضایا جن کی بناء پر اس قسم کا نتیجہ قائم ہے در حقیقت باطل ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سودیشی اصول کا مذہب پر اطلاق نہیں کر سکتے۔ اصول منطق کے مطابق ضدین میں سے اگر ایک قضیہ باطل ہو تو دوسرا صحیح ہوتا ہے۔ پس یہ ظاہر ہے کہ مذہب کے اصول کی صحت و بطالت کا تعلق کسی خاص ملک قوم رنگ یا نسل کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی اصول مذہب درست ہے تو کل ممالک و اقوام و ازمنہ اور تمام

Scanned with CamScanner

بنی نوعِ انسان کے لئے درست ہوتا ہے +

علاوہ ازیں وطنیت کا مذہب درحقیقت نسل اور خون کے اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ اصول کسی ایک قوم کی نسل کو دیگر اقوام کی نسل پر فوقیت دیتے ہیں۔ اور یہ تعلیم دیتے ہیں کہ مختلف نسلوں کے خون کی ملاوٹ نسل کی تنزلی کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً بعض آرین نسل کو دیگر اقوام کی نسلوں پر ترجیح دیتے ہیں چنانچہ بھاگوت گیتا میں جب ارجن کرشن جی کو کہتا ہے کہ میں اپنے عزیز و اقارب سے جنگ کرنا نہیں چاہتا تو کرشن جی اس کو ملامت کرتے ہیں اور جنگ پر اس کو یہ کہہ کر آمادہ کرتے ہیں :-

"اے ارجن جنگ میں سستی کرنا آرین نسل کے شانِ شایان نہیں"

(۲/۲ مترجمہ مسز اینی بسنت)

ایسے لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اس نسل کے انسانوں کو کسی دوسری نسل کے انسانوں سے شادی بیاہ کے تعلقات نہیں رکھنے چاہئیں۔ کیونکہ اس طرح مخلوط ہو کر نسل کا خون خراب ہو جاتا ہے اور نسل ترقی کرنے کی بجائے تنزلی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ لیکن جو شخص بیالوجی یا علم الحیات سے ذرا بھی واقف ہے وہ جانتا ہے کہ نسل اور خون کے یہ اصول غلط ہیں اور نوعِ انسانی پر عائد نہیں ہو سکتے۔ انسان اور حیوان میں فرق یہی ہے کہ حیوان کی نوع نسل اور خون کے اصولوں پر قائم ہے لیکن انسانی نوع جو ذی روح ہے روحانی اصول پر قائم ہے جن کا تعلق نسل اور خون جیسی مادی اشیا سے نہیں ہوتا +

انجیل جلیل کی تعلیم اس بارے میں نہایت صریح اور واضح ہے :-

"خدا نے ہر ایک قوم کو تمام روئے زمین پر رہنے کے لئے ایک ہی خون سے پیدا کیا" (اعمال ۱۷/۲۶)

اقوامِ عالم میں اختلافات ضرور ہیں۔ لیکن وہ محض سطحی اختلافات ہیں لہٰذا ان کے باوجود کُل بنی نوعِ انسان ایک ہیں۔ کسی انسان کی انسانیت اس کے رنگ یا ملک یا قوم یا اس کی تمدنی، اقتصادی یا سیاسی حالت پر مبنی نہیں بلکہ اس کی انسانیت اس بات میں ہے کہ خالقِ کائنات نے اس کو پیدا کیا ہے (لوقا ۳/۳۸ پیدائش ۱/۲۶۔ روم ۱/۱۲ وغیرہ)۔ اور "خدا کسی کا طرفدار نہیں بلکہ ہر قوم میں جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اور راستبازی کے کام کرتا ہے وہ خدا کو پسند آتا ہے" (اعمال ۱۰/۳۴) پس کوئی شخص خواہ کسی ملک قوم، ذات یا نسل کا ہو۔ "نجس اور ناپاک" نہیں (اعمال ۱۰/۲۸) کیونکہ سب بنی آدم ایک ہی آسمانی باپ کے فرزند ہیں (متی ۵/۴۵ وغیرہ)

اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پہ انحصار ۔ قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

(۱۲)

وطنیت یا سودیشی مذہب کے اصول اقوامِ عالم کو اپنے اپنے ملک کی چار دیواری کے اندر محدود کر دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ بین الاقوامی تعلقات کے قیام اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہیں۔ یہ امر مزید توضیح کا محتاج نہیں کہ بنی نوعِ انسان کی ترقی بین الاقوامی تعلقات کے نشوونما پانے اور اقوام و ممالک کے افراد کے باہمی میل ملاپ اخوت اور محبت پر منحصر ہے اور ہم وطنیت کے سودیشی مذہب کے اصولوں کو مان کر مختلف ممالک کی اقوام کو جغرافیائی حدود کے اندر رکھ کر باہمی میل جول کی راہ بند کر دیتے ہیں۔ ہمارا ملک صدیوں سے اس قسم کی مصنوعی پابندیوں میں پا بزنجیر رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندی قوم دیگر اقوام سے الگ تھلگ

اپنی زندگی بسر کرتی رہی ہے۔ اور اتفاق اور محبت و اُخوت کی بجائے وہ دیگر اقوام و ممالک کے افراد کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی رہی ہے اور ترقی کرنے کی بجائے تنزلی کرتی گئی ہے۔ وطنیت کے نظریہ کی رُو سے صرف قومیں باقی رہ جاتی ہیں۔ آدمیت فنا ہو جاتی ہے۔ آدمی درندہ اور انسان حیوان ہو جاتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہو جاتی ہے۔ اخوتِ انسانی پارہ پارہ ہو جاتی ہے +

ع اقوام میں مخلوقِ خُدا بٹتی ہے اس سے

انجیل جلیل کے اصُول کے مطابق ہم ملک یا قوم ذات نسل یا رنگ کے اختلافات کو بُنیادی اور حقیقی اختلافات قرار نہیں دے سکتے۔ چونکہ خُدا ایک ہے لہٰذا کُل بنی نوعِ انسان بھی ایک ہی اصل سے ہیں اور خُدا کے فرزند ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ خُدا کا کوئی مخلوق فی نفسہٖ پیدائش یا ذات یا قوم یا نسل کی وجہ سے دوسرے سے بالا یا برتر یا کمتر نہیں۔ خُدا کا کوئی منظورِ نظر نہیں اور نہ خُدا کسی کا طرف دار ہے۔ آسمانی باپ کے خاندان میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک فرزند اس کی بادشاہی کا وارث ہو اور دوسرا محرومُ الارث ہو بلکہ کُل بنی نوعِ انسان خواہ وہ کسی مُلک قوم یا نسل کے ہوں یکساں طور پر خُدا کی بادشاہی کے وارث ہیں +

جو لوگ مسٹر گاندھی کی طرح نسلِ انسانی کو مختلف اقوام میں منقسم کرکے اور سودیشی کے اصُول کا اطلاق کرکے معرفتِ الٰہی کو کسی خاص ملک یا قوم یا ذات کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں وہ یقیناً خُدا کی وحدانیت کے قائل نہیں اور اس کی ذات وصفات اور اس کی نجات کے علم

سے بے خبر ہیں۔ ہندو مت کروڑوں دیوتاؤں کا قائل ہے لہٰذا اس کے پیرو اس قسم کی خطرناک غلطی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے خُدائے واحد کی محبت کا جو خُداوند مسیح میں بنی آدم پر ظاہر ہوئی ہے تجربہ کیا ہے وہ اس چاہِ ضلالت سے نکل آئے ہیں اور اُن کا یہ ایمان ہے کہ خُدا جو دلوں اور گُردوں کا جاننے اور پرکھنے والا ہے وہ ہر کس و ناکس کو اور بالخصوص ہر قوم و مُلک کے گنہگاروں اور بدکاروں کو اپنی بے قیاس محبت سے نجات کی دعوت دیتا ہے +

—————(۱۳)—————

جن لوگوں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ بعض مذاہبِ باطلہ یہ سکھاتے ہیں کہ ہر ایک مُلک کا ایک خاص دیوتا ہوتا ہے جس کا اختیار اُس مُلک کی چار دیواری تک ہی محدود رہتا ہے اور بیرونجات پر اُس کا قبضہ نہیں ہوتا۔ ان مذاہبِ باطلہ کے مطابق ہر ایک مُلک کا دیوتا اس مُلک پر حکمران ہوتا ہے۔ پس اس مُلک کے باشندوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ صرف اُسی دیوتا کی پرستش کریں اور آس پاس کے ممالک کے دیوتاؤں کی پُوجا نہ کریں۔ وطنیت اور سودیشی مذہب کے ماننے والوں کی ذہنیت بعینہٖ ان مذاہبِ باطلہ کے پرستاروں کی سی ہے۔ جس طرح وہ یہ مانتے ہیں کہ ہر مُلک کے باشندوں کو چاہیے کہ صرف اپنے مُلک کے معبود کی پرستش کریں۔ اسی طرح وطنیت یا سودیشی مذہب کے شیدائی مانتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے مُلک و قوم کے معبود کی پرستش کرنی لازم ہے۔ اور اس قسم کی ذہنیت کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مختلف ممالک کے مختلف دیوتا ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام دیوتا اپنی اپنی جگہ برحق اور

اپنے اپنے ملک میں یکساں طور پر صاحبِ اختیار اور اپنے اپنے ملک کے باشندوں کے مال و جان پر قابض سمجھے جاتے ہیں۔ پس خدا کی وحدانیت کی بجائے خداؤں کی کثرت کو ماننا لازم آتا ہے اور دیوتا پرستی خدا پرستی کی جگہ لے لیتی ہے۔ لیکن جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ خدا ایک ہے وہ اس قسم کی بت پرستی کے ایمان کو مردود سمجھتے ہیں۔

علم الحیات کا مشہور پروفیسر جے۔ ایس۔ ہکسلے کہتا ہے:۔

"فطرت کی وحدت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ مذہب بھی ضرور ایک عالمگیر شے ہے۔ اور جس طرح فطرت ہر جگہ ایک ہے اسی طرح ایک ہی مذہب سب پر حاوی ہونا چاہیئے۔ صرف ایک واحد عالمگیر مذہب ہی اس قابل ہو سکتا ہے کہ مختلف اقوام عالم کو ایک لڑی میں پرو دے"[1]

پس نہ صرف خدا کی وحدت ہم کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ایک عالمگیر مذہب کی ضرورت کو مانیں بلکہ سائنسدان بھی ڈنکے کی چوٹ یہی اعلان کرتے ہیں کہ فطرت کی وحدت اس بات کو منوانے پر ہمیں مجبور کرتی ہے کہ کوئی نہ کوئی مذہب عالمگیر ہو۔

(۱۵)

مسیحی نجات کا اصول اس بات پر زور دیتا ہے کہ مسیح کل بنی نوع انسان کے لئے موا۔ پس نہ صرف انجیلی ایمان کہ خدا ایک ہے ہم کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم نوع انسانی کو ایک مانیں بلکہ مسیحی نجات کا اصول بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ مسیحی عالمین کی صلیب کے سایہ کے نیچے ہر قسم کی مصنوعی امتیازات اور عارضی اختلافات کا خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ

[1] J. S. Huxley, Essays of a Biologist, pp. 301-2

کوہِ کلوری پر ہم کو تمام اقوام و ممالک ایک جگہ جمع دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں ہر گنہگار خواہ وہ کسی قوم نسل یا ذات کا ہو خدا کی محبت کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اور ہر بدکار خواہ وہ کسی ملک کا ہو توبہ کے ذریعہ از سرِ نو زندگی بسر کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ چنانچہ انجیل جلیل میں مرقوم ہے کہ:۔

"وہی مسیح ہماری صلح ہے جس نے کل اقوام کو ایک کر دیا اور جدائی کی دیوار کو جو بیچ میں تھی ڈھا دیا" (افسی ۲: ۱۴)

لیکن ہندو مت اس قسم کی نجات کا قائل نہیں۔ ہندو مت کے ذات پات کے اصول اور مسٹر گاندھی کے سودیشی مذہب وطنیت کے اصولوں نے ملک اور قوم جیسی سطحی امتیازات کو مقدم قرار دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ نوع انسانی کو "نوع" کہنا سخت غلطی میں گرفتار ہونا ہے۔ کیونکہ وہ ایک "نوع" نہیں بلکہ مختلف اور متضاد گروہوں ملتوں ذاتوں قوموں اور نسلوں کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ گویا نوع انسانی کا وجود محبت کے لئے نہیں بلکہ باہمی جنگ و جدل کے لئے ہے۔ اور نوع انسانی اخوت و مساوات کی خاطر صفحۂ دہر پر ظاہر نہیں ہوئی بلکہ باہمی تقسیم اور منافرت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ وطنیت کے مذہب کے اصول کے مطابق ہر ملک و قوم کے خاص اوصاف ہیں اور کسی ایک ملک یا قوم کی خصوصیتیں دیگر ممالک و اقوام کے افراد میں موجود نہیں ہو سکتیں کیونکہ یہ خصوصیتیں ان ممالک و اقوام کے خون میں نہیں ہوتیں۔ اور ان کی ذات ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ پس وطنیت اور سودیشی مذہب کے اصول کے مطابق روئے زمین

کے مختلف ممالک واقوام کے افراد کے درمیان ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہے جو کسی طرح بھی عبور نہیں کی جا سکتی۔ اور جیسا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جو ہم کو الحاد اور کفر کی جانب لے جاتا ہے ÷

(۱۶)

ان خطرناک نتائج وعواقب کی وجہ سے مسٹر گاندھی کے جانی دوست مرحوم سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے ایک خط آپ کو بایں الفاظ متنبہ کیا تھا۔ "آپ کے اس قول سے کہ تمام مذاہب برابر ہیں۔ مجھے بہت صدمہ پہنچا ہے کیونکہ یہ بات حقیقت کے مطابق نہیں ہے اور میرا ذاتی تجربہ بھی اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ آپ کا یہ اعلان کہ انسان کو ہمیشہ اپنا آبائی مذہب قائم رہنا چاہئے۔ مذہب کو ایک جامد اور بے معنی شے بنا دیتا ہے حالانکہ مذہب زندگی کے ہر شعبہ کا محرک ہونا چاہئے۔ اگر آپ کا یہ خیال درست ہے تو مجھے ہمیشہ ایک تنگ فرقہ کی تنگ حدود میں رہنا چاہئے تھا کیونکہ میں نے اسی فرقہ میں جنم لیا تھا۔ آپ نے خود کئی بار کہا ہے کہ اگر اچھوت پن ہندو مت کا جزو ہے تو میں ہندو نہیں رہ سکتا۔"... مسیح میرے لئے ایک وسیلہ ثابت ہوا ہے جس کے ذریعہ میں نے الٰہی معرفت حاصل کی ہے۔ اور میں اس سرور کی حقیقت بتلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انجیل کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ مسیح نے ذات۔ نسل اور رنگ کی دیواروں کو ڈھا دیا اور کہ اس کا پیغام کل بنی آدم کیلئے ہے۔ جب کوئی شخص صدق دل سے کسی بات کو مانتا ہے تو وہ اس کا اعلان کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پولوس رسول کہتا ہے "اگر میں انجیل کی خوشخبری سنانے پر مجبور ہوں بلکہ مجھ پر افسوس اگر میں خوشخبری نہ سناؤں" (۱ کرنتھیوں ۹: ۱۶) آپ خود اہنسا کے اصول کا پرچار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ... جب کوئی شخص بپتسمہ پاتا ہے تو وہ اپنی قوم اور ملک کو ترک نہیں کر دیتا۔ بلکہ وہ "شیطان اور اس کے سب کاموں کو دنیا کی ادنیٰ باتوں کو اور نفس کی بری خواہشوں کو ترک کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک اور قوم کی اچھی چیزوں کو ترک نہیں کرتا۔ چنانچہ مقدس پولوس کہتا ہے "اے بھائیو جتنی باتیں حق ہیں اور شرافت کی ہیں اور واجب ہیں اور جتنی باتیں پاک اور پسندیدہ اور دلکش ہیں غرض جو نیکی اور تعریف کی باتیں ہیں ان پر غور کیا کرو تو خدا جو صلح کا بانی ہے تمہارے ساتھ رہے گا۔ (فلپیوں ۴: ۸) میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوؤں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان فاصلہ ہے۔ لیکن عقائد کے اختلاف کی بنا پر ہمیں ایک دوسرے کو مطعون کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے" (ایپیفنی ۳۔ مئی ۱۹۳۱ء)

مرحوم مرتے مرتے گاندھی جی کو یہ وصیت کر گئے ہیں۔ ؎

مرا دبا نصیحت بود و گفتیم
حوالت باخدا کردیم و رفتیم

باب پنجم

عالمگیر مذہب کی خصوصیات

سودیشی مذہب عالمگیریت اور قطعیت کے منافی ہے

وطنیت اور سودیشی مذہب کے اصول سے یہ لازم آتا ہے کہ عالمگیر مذہب کے امکان کا انکار کیا جائے۔

اگر ہر ملک وہر زمانے کی طرح ہر ملک وہر مذہب کا تصوّر درست ہے تو یہ ظاہر ہے کہ کوئی مذہب عالمگیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر مذہب اپنے اپنے ملک کے باشندوں کے لئے اپنی اپنی جگہ یکساں طور پر درست اور صحیح ہوگا اور یہ گنجائش ہی نہیں رہیگی کہ کسی مذہب کی اس کے اپنے ملک کے باہر ضرورت ہو یا کوئی ایک مذہب ایک سے زیادہ ممالک واقوام پر حاوی ہو۔ ہر ملک کے مذہب کے اصول اس کے باشندوں کے لئے درست ہونگے۔ اور اس ملک کی چار دیواری کے باہر وہ اصول ناکارہ ثابت ہونگے پس کوئی مذہب عالمگیر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھ سکتا کیونکہ عالمگیر مذہب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے اصول تمام ممالک واقوام وازمنہ کی رہنمائی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور کل بنی نوع انسان پر حاوی ہیں۔ وطنیت اور سودیشی مذہب کے اصول زمان ومکان کی قیود میں مقید ہوتے ہیں لیکن عالمگیر مذہب کے اصول زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہوتے

ہیں ✣

(۲)

وطنیت اور سودیشی مذہب کے اصُول کے ماننے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ کسی ایک مذہب کی قطعیت کا انکار کیا جائے۔ اگر یہ درست ہے کہ ہر ملک و زمانہ کا مذہب اپنی اپنی جگہ برحق ہے تو یہ ظاہر ہے کہ کسی مذہب کے اصُول قطعی نہیں ہو سکتے اور نہ کوئی مذہب یہ دعوےٰ کر سکتا ہے کہ اس کا مکاشفہ آخری اور ختمی طور پر کامل اور اکمل ہے اور اس اعلےٰ ترین مکاشفہ کے بعد کسی بہتر مکاشفہ کا امکان نہ صرف بعید از قیاس بلکہ محال ہے۔ سودیشی مذہب کے قضایا سے یہ نتیجہ ایسا صاف اور صریح ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ چنانچہ بمبئی کے مشہور ہفتہ وار انگریزی اخبار انڈین سوشل ریفارمر کا ہندو ایڈیٹر لکھتا ہے:۔

"بدھ اور کرشن جیسے عظیم الشان اُستادوں کی تعلیم کو ہمیں قطعی سمجھ کر قبول نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی تعلیم کو ایک قدم آگے بڑھائیں تاکہ نوع انسانی کی اخلاقی اور رُوحانی ترقی ہو" (۱۹۲۸ء، ۱۸ فروری)

اگر یہ درست ہے کہ ہر قوم کے لئے اس کا اپنا مذہب کافی سچا اور برحق ہے تو لا کلام ہم اس نتیجہ سے گریز نہیں کر سکتے کہ ہم حقیقت کو قطعی طور پر نہیں جان سکتے۔ ہر شخص کے لئے وہی سچ اور حق ہے جو وہ مان لے۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ درحقیقت سچائی کوئی شے نہیں اور حق کوئی خارجی حقیقت و وجود نہیں رکھتا۔ وہ محض ایک ذہنی شے ہے جس کا انحصار ہر شخص کے اپنے خیالات پر ہے۔ فلسفیانہ اصطلاح میں اس قضیہ کو الحاد اور مذہبی اصطلاح میں اس کو کُفر کہتے ہیں۔ پر اگر مذہب کا

معبود اور مسجُود کوئی حقیقی وجود رکھتا ہے تو اس کا وجود انسان کے علم سے بے نیاز ہے۔ جس طرح ہر مادی شے جو خارجی وجود رکھتی ہے اپنے وجود کے لئے انسان کے ذہن کی مرہونِ منت نہیں ہوتی۔ اب اگر اس معبودِ حقیقی کا علم یقینی طور پر ممکن ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ایسا حقیقی اور یقینی علم اور کوئی دوسرا ظنی علم دونوں یکجا نہیں ہو سکتے۔ چونکہ ظنی علم میں بطالت کا عنصر ضرور ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ علم ظنی علم ہوتا ہے لہٰذا ایک برحق مذہب کی موجودگی میں ظنی علم کے مذاہب قائم نہیں رہ سکتے۔ پس تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح اور راست نہیں ہو سکتے ✣

(۳)

خُدا کا یقینی علم جو ہم کو حاصل ہے۔ صرف کسی ایک قوم یا مذہب یا ملک کے لئے راست نہیں۔ بلکہ کُل رُوئے زمین کی اقوام و ممالک کے لئے راست ہے۔ وہ علم ایک ایسی قسم کا ہے جس کا کسی خاص قوم یا مُلک پر انحصار نہیں۔ اس کو ہم ایک مثال سے واضح کر دیتے ہیں۔ اگر مادی اجسام کے لئے قانون کششِ ثقل کوئی حقیقت رکھتا ہے اور یہ قانونِ ثقل سچ ہے تو یہ قانون کسی ایک ملک یا زمانہ کے لئے درست اور صحیح نہیں ہوگا بلکہ کُل ممالک و ازمنہ کے لئے درست اور صحیح ہوگا۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ خُدا کے علم کی تحصیل مادی اشیاء کے علم کی مانند سہل نہیں۔ لیکن اس اعتراض سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ معرفتِ الٰہی کو حاصل کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　تا نہ بخشند خُدائے بخشندہ

لیکن اس اعتراض سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خُدا کی ذات کے متعلق

ہر ملک و زمانہ کے لوگوں کا علم یکساں طور پر صحیح ہے۔ یہ نرالی منطق ہے کہ دُنیاوی علوم مثلاً علم کیمیا۔ علم ریاضی وغیرہ کے اصُول تمام زمانوں ملکوں اور قوموں کے لئے ایک ہوں اور راست ہوں۔ لیکن معرفتِ الٰہی کا علم تمام ممالک و ازمنہ کیلئے ایک نہ ہو اور راست نہ ہو۔ معرفتِ الٰہی کی حقیقت کا انکار در حقیقت ذاتِ الٰہی کی حقیقت کا انکار ہے ؛

پس اگر ہم ملحدانہ خیالات سے بچنا چاہتے ہیں تو ہم کو لا کلام ماننا پڑیگا کہ ہم حقیقت کو جان سکتے ہیں اور کہ حق ایک ایسی شے ہے جس کا انحصار کسی خاص فرد یا قوم یا ملک پر نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک حقیقت ہے جو تمام افراد ممالک اور اقوام پر حاوی ہے۔ چونکہ مسٹر گاندھی سودیشی مذہب کے ماننے والے ہیں لہٰذا وہ اس بات کا انکار کرنے پر مجبور ہیں کہ ہم خدا کی حقیقت کو جان سکتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں "ہم جو خدا کے سامنے رینگنے والی مخلوق کی مانند ہیں اس کی لامحدود عظمت۔ محبت اور رحم کو کس طرح جان سکتے ہیں ؟" یہ عقیدہ ملحدانہ ہے۔ اور ہم اس کو نہیں مان سکتے۔ کیونکہ اگرچہ ہم محدود العقل ہونے کی وجہ سے خدائے لامحدود کو کامل طور پر نہیں جان سکتے پر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم کو خدا کی معرفت حقیقی اور قطعی طور پر حاصل نہیں ہو سکتی۔ یا کہ ہم مختلف مذاہب کے تصورات میں سے بھلے بُرے کی تمیز نہیں کر سکتے یا کہ کسی قطعی مکاشفہ کا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ ہم اس بات کو ایک مثال سے سمجھا دیتے ہیں۔ کسی سائنسدان کو ذرّیت (Atom) کا علم کامل طور پر حاصل نہیں اور رُوئے زمین پر کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ذرّات کی نسبت جو علم حاصل ہو سکتا ہے وہ سب اُس کو حاصل ہے

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی سائنسدان کا موجودہ علم در حقیقت راست اور درست نہیں اور ذرّیت کے مختلف نظریہ جات جو ابتدائے آفرینش سے تا حال مختلف ممالک و اقوام اور ازمنہ کے فضلاء نے وضع کئے ہیں وہ سب کے سب یکساں طور پر صحیح ہیں اور ان میں اچھے بُرے کی تمیز کرنا وقتِ عزیز کو گنوانا ہے ؛

(۴)

مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ خُدا لامحدود ہے لیکن اس لفظ سے وہ یہ مُراد لیتے ہیں کہ اس کے لامحدود نام ہیں اور ہر شخص اپنی پسند کے موافق اس کا نام پکار کر اس سے دُعا کر سکتا ہے۔ لیکن جب ہم خُدا کو لامحدود کہتے ہیں تو اس سے ہماری مُراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ زمان و مکان کے لحاظ سے لامحدود ہے یا اس کے نام لامحدود ہیں بلکہ ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی صفات مثلاً رحم۔ محبت وغیرہ کی کوئی حد نہیں مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ چونکہ تمام مذاہب میں خُدا کا تصوّر موجود ہے لہٰذا وہ سب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ بفرضِ محال اگر ہم تسلیم بھی کریں کہ ادیانِ عالم میں خُدا کا تصوّر موجود ہے تو ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا تصوّر خدا کی مجرّد موجودگی کُل مذاہب کو یکساں طور پر حق اور درست قرار دے سکتی ہے ؟ کیا تمام مذاہب میں خُدا کا تصوّر یکساں ہے کہ وہ سب برابر طور پر حق اور صحیح قرار دیئے جائیں ؟ جیسا ہم پیشتر ذکر کر چکے ہیں جس شخص نے ادیانِ عالم کا سطحی طور پر بھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ خُدا کے تصوّرات کی وجہ ہی سے مذاہب میں اختلاف ہے۔ اس کی بجائے کہ خُدا کا تصوّر تمام مذاہب کو یکساں کر دے وہ اُن میں جُدائی ڈالتا ہے۔ خُدا کے

تصورات کے اختلاف کی وجہ سے مذاہب ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہ اختلافات سطحی اختلافات نہیں بلکہ بنیادی اور اصولی اختلافات ہیں جن کی وجہ سے مختلف مذاہب میں مطابقت اور کلّی موافقت محالِ عقلی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہندو دھرم کے بعض فرقے اور اسلام اور مسیحیت کے پیرو ایک خدا کو مانتے ہیں۔ لیکن تینوں مذاہب میں جو تعلیم ذاتِ الٰہی کی نسبت پائی جاتی ہے وہ ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے کہ ان کو برابر قرار دینا تو ایک طرف رہا اُن کو یکجا کرنا اجتماع الضدّین کو یکجا کرنے کے مترادف ہے۔ پس محض خدا کو ماننے سے مذاہب میں باہمی موافقت کس طرح ہو سکتی ہے؟ جس قسم کے ایشور کو ہندو دھرم مانتا ہے اسلام کے نزدیک وہ عقیدہ کفر ہے۔ جس قسم کے اللہ کو اسلام مانتا ہے مسیحیت کے نزدیک وہ نہایت غیر مکمل ہے۔ آریہ سماج کے تصورِ خدا اور مسیحیت کے تصورِ خدا میں ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہے جو کسی عقلی کرشمے سے عبور نہیں کی جا سکتی۔ پس سوال یہ نہیں کہ ہر شخص خدا کو مانتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے خدا کو مانتا ہے کیونکہ ہر انسان کی یہ قدرتاً تمنا ہوتی ہے کہ اس میں وہی اوصاف پیدا ہوں جو اس کے معبود میں ہیں۔ چنانچہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ **تخلقوا باخلاق الله** یعنی تم اپنے اندر اللہ کی سی صفات پیدا کرو اور بھاگوت گیتا میں کرشن کہتا ہے ؎

جس کو پوجے اُس کو پائے پتّر یا جنّات
میری پوجا کرنے والا پائے میری ذات (مترجمہ مفتی غلام رسول)

جس سے ظاہر ہے کہ ہر انسان کا اخلاقی نصب العین اور

روحانی مطمحِ نظر اُسی قسم کا ہوگا جس قسم کا اس کا معبود ہوگا۔ پس اگر اس کا تصورِ خدا غلط ہوگا تو اس سے اخلاق سوز حرکات سرزد ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ بائبل شریف میں اہلِ یہود کے انبیاء مثلاً حضرت یرمیاہ اور حضرت یسعیاہ اپنی اُمت اسرائیل کو دیگر مذاہب کے معبودوں کی پرستش سے منع کیا کرتے تھے۔ مثلاً اہلِ یہود کے قرب و جوار کی بُت پرست اقوام سونے کے بیل کی پرستش کرتی تھیں جس سے بنی اسرائیل پر یہ اثر ہوا کہ وہ سونے اور چاندی کو وقعت دینے لگ گئے تھے۔ بیل طاقت کی نشانی تھی۔ لہٰذا بنی اسرائیل ہمیشہ اس آزمائش میں مبتلا رہتے تھے اور زندہ خدا کو چھوڑ کر قوت اور طاقت کے مظاہرہ پر بھروسا رکھتے تھے۔ لہٰذا خدا نے اپنے نبیوں کی معرفت ان کو بار بار تنبیہ کیا اور فرمایا "نہ زور سے اور نہ طاقت سے بلکہ میری رُوح سے خداوند رب الافواج فرماتا ہے" (ذکریاہ ۴:۶) اسی طرح ہمارے مُلک کے ہندو کالی دیوی کے آگے قربانیاں چڑھاتے ہیں اور اس کا اثر ہمارے ہم وطنوں کے اخلاق پر پڑتا ہے۔ لیکن خداوند مسیح کی صلیب کے اردگرد ہم کو کالی گھاٹ کی سی فضا نہیں ملتی جس میں دم گھٹنے لگے۔ ابن اللہ کے پرستاروں کو حکم ہے کہ :۔

"تم اپنے بدن ایسی قربانی ہونے کے لئے نذر کرو جو زندہ پاک اور خدا کو پسندیدہ ہو۔ یہی تمہاری معقول عباوت ہے" (روم ۱:۱۲)

پس سوال درحقیقت یہ ہے کہ کس قسم کا خدا بنی نوعِ انسان کا معبود ہو سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم ہے کہ خدا انتقام لینے والا خدا ہے جو قہار ہے اور جبار ہے اور وہ گنہگاروں کو نارِ جہنم میں ڈالتا ہے۔ انجیل جلیل کی تعلیم ہے

کہ خُدا محبت کرنے والا باپ ہے جو گنہگاروں کو بے حد پیار کرتا ہے اور محبت کے ذریعہ اُن کو اپنی طرف لوٹا لاتا ہے۔ آریہ سماجی کہتا ہے کہ خُدا ہرگز ہمارے گُناہوں کو معاف نہیں کرتا۔ اور کرم اور تناسخ کے چکّر کی تعلیم دیتا ہے۔ گاندھی جی نے خود کہا تھا کہ صوبہ بہار کے ۱۹۳۴ء کے زلزلے وہاں کے باشندوں کے گُناہوں کی سزا تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خُدا کے یہ تینوں تصوّر جو ایک دوسرے کی ضدّ ہیں یکساں طور پر درست اور صحیح ہو سکتے ہیں؟ ہر صاحبِ ہوش جانتا ہے کہ اجتماع الضدّین محالات میں سے ہے۔ ان مختلف نظریوں میں سے اگر ایک درست ہے تو دوسرا لازمی طور پر غلط ہوگا اور دونوں صحیح نہیں ہو سکتے۔ ایک اور مثال لے لیجئے۔

یہودیت مسیحیت اور اسلام متفقہ طور پر خُدا کا ایک ایسا تصوّر پیش کرتے ہیں جو بُت پرستی کے خلاف ہے۔ مسٹر گاندھی ہندو مذہب کے ہم نوا ہو کر کہتے ہیں کہ "میں بتوں کے ماننے کے خلاف نہیں ہوں"۔ اب یہ دونوں یکساں طور پر صحیح اور درست نہیں ہو سکتے۔ اگر یہودی مسیحی اور اسلامی تصوّر درست ہے تو سناتن دھرم اور گاندھی جی کا تصوّرِ خُدا غلط ہے اور اگر آپ کا تصوّر صحیح ہے تو پہلا تصوّر غلط ہوگا:

چند ایک اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

اسلام میں گائے کی قربانی جائز ہے۔ لیکن گئو رکھشا مسٹر گاندھی کے مذہبی عقیدہ میں داخل ہے۔ اب فرمائیے کہ دونوں یکساں طور پر کس طرح صحیح اور درست ہونگے؟

گاندھی جی عدم تشدّد کو اپنے مذہب کا جُزوِ اعظم مانتے ہیں لیکن اگر ایک کٹّر پٹھان مسلمان بحکم آیۂ قرآن وقاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ

ویکون الدین کلّہ للّٰہ" (یعنی "تم ان سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فسادِ عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور دین خالص اللّٰہ ہی کا ہو جائے" (ترجمہ اشرف علی تھانوی) کسی مشرک کو قتل کر دے۔ تو اب گاندھی جی ان دونوں متضاد باتوں کو یکساں طور پر صحیح اور درست کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں؟

گاندھی جی ذات پات کی تقسیم کو انسانی سرشت میں داخل سمجھتے ہیں۔ جس طرح یونان کا مشہور فلاسفر ارسطو غلامی جیسی قبیح چیز کو انسانی سرشت میں داخل سمجھتا تھا۔ گاندھی جی اس ذات پات کے تفرقہ کو اپنے مذہب کا جزو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "میں ورن آشرم دھرم کا قائل ہوں"۔ لیکن ایک مسیحی کُل بنی نوع انسان کو خُدا باپ کا خاندان تصوّر کر کے ذات پات کی تقسیم کو ننگِ انسانیت قرار دیتا ہے۔ اب مسٹر گاندھی کس طرح دو متضاد عقائد کو یکساں طور پر حق اور درست تسلیم کر سکتے ہیں؟

ویدانت اور مسیحیت کے اصولوں کو لیجئے۔ دونو مذاہب خُدا و خلقت کی نسبت جُداگانہ عقائد رکھتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ہرگز مطابقت نہیں رکھتے۔ تو کیا ہم یہ مان سکتے ہیں۔ کہ ان دونوں مذاہب میں درحقیقت کوئی فرق نہیں بلکہ فرق صرف سطحی ہے جب حقیقت یہ ہے کہ اُن میں بُعد المشرقین کا فرق ہے؟

کیا پُرانوں کے کرشن اور انجیل کے مسیح میں بنیادی اور اصولی فرق نہیں ہیں؟ کیا دونوں کی اخلاقی اور رُوحانی حالت ایک ہی سطح پر ہے اور یکساں طور پر دونوں مساوی درجہ کے ہیں؟ جس شخص کو کرشن کے کارناموں سے اور خُداوند مسیح کے خیالات جذبات اور افعال سے رتّی بھر

بھی واقفیت ہے۔ وہ فوراً بول اُٹھے گا کہ ؏

ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بہ کجا

کوئی شخص بھی جس کے سر میں دماغ اور دماغ میں عقل ہے یہ نہیں کہہ سکتا کہ پرانوں کے کرشن کے کارنامے تمام ممالک اور اقوام اور ازمنہ کے لئے بہترین نصب العین ہیں۔ لیکن انجیل کا مسیح دو ہزار سال سے مختلف ممالک اور اقوام اور ازمنہ کے لاکھوں بلکہ کروڑوں اشخاص کے لئے ایک کامل اور اکمل نمونہ رہا ہے اور اب بھی مشرق و مغرب کے ممالک کے لوگ اُس خداوند کے سامنے ہی سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور تاقیامت کرتے رہیں گے۔ گاندھی جی بھاگوت گیتا کے کرشن کے مداح ہیں۔ لیکن کیا بھاگوت کا کرشن خُدا کا اعلیٰ ترین مظہر اور رُوحانیت کا کامل نمونہ ہے؟ بھاگوت گیتا ایک فلسفیانہ کتاب ہے جس میں کرشن مہاراج کے کیریکٹر کو دکھایا نہیں گیا تاہم جو کچھ اس میں ہم کو نظر آتا ہے وہ ایسا نہیں کہ دُنیا کے لئے مطمحِ نظر ہو۔ مثلاً گیتا کے شروع ہی میں ارجن اس خیال سے کانپ اُٹھتا ہے کہ وہ جنگ میں اپنے رشتہ داروں کو قتل کرنے والا ہے اور کہتا ہے :۔

"افسوس ہم سلطنت کی خاطر اپنے عزیز و اقارب کو قتل کرنے کے گناہ میں مبتلا ہیں"

ہمارے دلوں میں ارجن کے لئے عزت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ شخص قتل اور خون کرنے کی بجائے اپنی سلطنت قربان کرنے کو تیار ہے۔ لیکن بھاگوت گیتا کے کرشن مہاراج کیا جواب دیتے ہیں؟ آپ کہتے ہیں کہ تُم بے شک قتل اور خون کرو۔ کیونکہ تُم انسان کی رُوح کو قتل نہیں

کرتے بلکہ اس کے جسم کو قتل کرتے ہو (۲/۹)!! کیا کوئی قاتل کسی عدالت میں یہ دلیل عذر کے طور پر پیش کر سکتا ہے؟ کیا ایسی دلیل کا پیش کرنے والا خُدا کا اعلیٰ ترین مظہر قرار دیا جا سکتا ہے؟ مہاتما جی اہمسا کے قائل ہیں۔ کیا وہ اپنے اہمسا کے اصُول کو پیش نظر رکھ کر گیتا کے کرشن اور پہاڑی وعظ کے مسیح کو یکساں طور پر خُدا کے اوتار اور مساوی درجہ کے اعلیٰ ترین مظہر کہہ سکتے ہیں؟ ایک ہندو نے کیا خُوب لکھا ہے کہ :۔

"مسیح کی صلیب نے انسانی نسل کی تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کوہ کلوری کی صلیب نے اوتاروں کی آمد کی غرض اور مدعا کو کلیتہً تبدیل کر دیا ہے۔ یسُوع سے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اوتار لینے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ جنگی طاقت اور جسمانی قوت سے بدی کو مغلوب کیا جائے۔ لوگ یہ خیال کرتے تھے اور اب بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ جب خُدا انسانی جسم اختیار کر کے اس دُنیا میں آتا ہے تو اس کے آنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان اشخاص کو قتل کرے جو مجسم بدی ہیں تاکہ نیکی کی فتح ہو۔ لیکن کیا کسی ایک شخص کے مرنے یا کسی جنگ کے واقع ہونے سے بدی مغلوب ہو جاتی ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہوتا۔ مسیح کی صلیب نے بدی کو مغلوب کرنے کا ایک نیا طریقہ دُنیا پر ظاہر کیا ہے۔ صلیب کا مقصد محض بدی کو مغلوب کرنا ہی نہیں بلکہ بدکردار شخص کو جس سے بدی ظہور میں آتی ہے نیک اور راستباز بنانا ہے۔ اگر ہم بدکردار شخص کو جان سے مار ڈالتے ہیں تو بدی کو جڑ سے اکھاڑ نہیں دیتے۔ اس کے برعکس جسمانی طاقت کا مظاہرہ بدی کو پھیلاتا ہے۔ اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ بدکردار شخص کو نیک کردار بنا دیا جائے" (گارڈین ۲ مئی ۱۹۳۵ء)

اب مہاتما جی ہی ہم کو بتلائیں کہ خُدا کے اوتار لینے کے یہ دو مقصد جو گیتا اور انجیل میں مذکور ہیں کس طرح یکساں طور پر صحیح اور درست ہو سکتے ہیں؟ ان دونوں کو یکساں طور پر صحیح ماننے والا اس شخص کی مانند ہے جو بیک وقت دو متضاد سمتوں میں جانے والی گاڑیوں میں سوار ہونا چاہے۔

خود ہندو مذہب میں شکتی مت کے اصول اور وشنو مت کے اصول میں عظیم فرق ہے۔ وہ ایک دوسرے سے کوسوں دُور ہیں۔ پس دونوں یکساں طور پر صحیح اور راست نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح بُدھ مت اور مسیحیت میں عظیم فرق ہے۔ ایک قابل بودھ محقق مسٹر ڈی۔ بی۔ ایلے پولا (D. B. Ellopola) کہتا ہے[1]

> میں اس تلاش میں تھا کہ مسیحیت اور بُدھ مت میں کوئی بات ایسی ملے جو دونوں میں بُنیادی طور پر مشترک ہو۔ لیکن مجھ کو نہ ملی۔ مسیحیت کی تعلیم کی اساس دُعا اور ایمان ہیں۔ لیکن بودھ مذہب کی نظر میں ان دونوں کی کچھ وقعت نہیں۔

ڈاکٹر البرٹ شوٹیزر (Schweitzer) کہتا ہے:-

> "یسوع مسیح کے خیالات میں اور بُدھ یا برہمنوں کے خیالات میں کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے کلیتہً مختلف ہیں۔ برہمن اور بُدھ دُنیا کو کہتے ہیں کہ دُنیا میں تم اس طرح رہو کہ گویا مر گئے ہو۔ اور اس کے ساتھ تمہارا کسی قسم کا واسطہ نہیں رہا۔ لیکن یسوع کی انجیل کہتی ہے کہ تم دُنیا میں اپنے نفس پر قابو پا کر اس طرح محبت بھری زندگی بسر کرو جس

1 Quoted by Dr. Macnicol in Fellowship for August, 1928

سے خُدا کا جلال ظاہر ہو۔ ہندو دھرم کے مطابق خُدا ایک سمندر ہے۔ جس میں انسان تیرنے سے تنگ آ کر ڈوبنا چاہتا ہے۔ لیکن مسیحیت کا خُدا ایک زندہ اخلاقی ہستی ہے جو ہمارا باپ ہے اور ہماری قوتِ ارادی کو تقویت عطا کر کے اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ ان دونوں تصورات میں بنیادی فرق ہے۔ برہمن مت اور بُدھ مت میں اخلاق صرف الفاظ تک ہی محدود ہے لیکن اس کا اثر افعال پر نہیں پڑتا۔ ایسے مذاہب کسی طرح بھی محبت کے مذاہب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان مذاہب میں روحانیات کا تعلق محبت کے جذبہ کے ساتھ نہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ روحانیات کا تعلق اخلاقیات کے ساتھ ہے اور روحانی نصب العین اخلاقی زندگی میں ظہور پکڑتا ہے۔ جَینی دھرم یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ ترس اور ہمدردی کا مذہب ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے دلوں میں تمام مخلوقات کے لئے ترس ہونا چاہئے لیکن ساتھ ہی اپنا نصب العین یہ قرار دیتا ہے کہ ہم کو ہر طرح کے جذبہ سے خالی اور ہر طرح کے فعل سے پرہیز کرنی چاہئے حتیٰ کہ نیکی اور رحم دلی کے جذبات پر بھی ہم کو غالب آنا چاہئے۔ پس اس مذہب میں رحم، ترس، ہمدردی وغیرہ کے جذبات محض زبانی جمع خرچ ہیں جن کا رتی بھر اثر روزمرہ زندگی پر نہیں پڑتا"۔

بُدھ کے زمانے میں مجرموں کے اعضا کاٹ کر ان کو زندہ رکھا جاتا تھا۔ تا کہ وہ درد کے مارے کراہتے کراہتے مریں۔ لیکن گو مہاتما بُدھ نے حیوانات پر ظلم کرنے کے خلاف تعلیم دی۔ لیکن آپ نے مجرم انسانوں کے ساتھ اس قسم کی بیرحمی کے خلاف کبھی صدائے احتجاج بلند نہ کی۔

(۷)

گاندھی جی اور ان کے ہم خیال اصحاب کے نظریہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے

کہ کوئی مذہب عالمگیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا ہماری عقل اس بات کو مان سکتی ہے کہ اگر کوئی بات حق اور درست ہے تو وہ صرف ایک خاص قوم اور طبقہ کے لئے ہی حق اور درست ہے۔ اور دوسری قوموں اور طبقوں کے لئے وہ باطل اور ناقابلِ قبول ہے؟ اگر خدا کا کوئی تصوّر درحقیقت برحق ہے تو کیا وہ صرف کسی خاص قوم اور طبقہ کے لئے ہی برحق ہے؟ کیا وہ کُل اقوام اور ممالک اور بنی نوع انسان کے لئے سچا اور برحق نہ ہوگا؟ کیا خدا کا اعلیٰ ترین تصوّر ایک ملک اور قوم کے حق میں اکسیر ثابت ہو کر اس قوم اور ملک کے افراد کی اہم اور بنیادی انسانی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے لیکن دوسری قوم اور دوسرے ملک کے افراد کے حق میں زہرِ قاتل ثابت ہو کر ان کی اصلی اور بنیادی انسانی تقاضاؤں کو برباد کر سکتا ہے؟ کیا انسانی سرشت ایک واحد اور ناقابل تقسیم شے نہیں ہے؟ اور کُل نوعِ انسانی ایک ہی خمیر سے پیدا نہیں ہوئی؟ اگر تمام ممالک اور اقوام کے انسانوں کی سرشت درحقیقت ایک ہی ہے تو کیا خدا کا اعلیٰ ترین تصوّر سب اقوامِ عالم کے لئے اعلیٰ ترین نہیں ہوگا؟ پس لازم ہے کہ کوئی نہ کوئی مذہب عالمگیر مذہب ہو جو اقوامِ عالم کا ہادی اور رہنما ہو اور جس کے اصول ہر زمانہ اور ملک اور قوم کے افراد کے لئے نصب العین کا کام سرانجام دیں۔ اور جب تک انسان صفحۂ ہستی پر موجود ہے تب تک وہ مذہب اس کی سرشت کے اصلی تقاضاؤں اور بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے ؛

ہم ایک مثال سے اس بات کو واضح کر دیتے ہیں۔ علمی دنیا میں

مختلف امور کی نسبت ہزاروں نظریہ جات انسانی عقل نے ایجاد کئے ہیں۔ لیکن کوئی صاحبِ عقل ان تمام نظریوں کو یکساں طور پر درست اور صحیح نہیں مانے گا۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اب کوئی صاحبِ ہوش یہ نہیں کہیگا کہ یہ دونوں نظریئے یکساں طور پر صحیح اور درست ہیں۔ یہ محض خیالات کا اختلاف ہے۔ زمین اور سورج کی ہستی کے تو دونو قائل ہیں۔ ایک قوم اور ملک پہلا نظریہ مان لے اور وہ نظریہ اُس کو مبارک ہو۔ دوسرا ملک دوسرا نظریہ مان لے اور وہ اُس کو مبارک ہو۔ محض نظریوں پر بحث کر کے مُفت سردردی کیوں مول لیتے ہو ؛

سائنس کے حقائق کا انکشاف اس طرح نہیں ہُوا کہ بنی نوع انسان کے ہر قسم کے توہمات کو یکساں اور برابر طور پر تسلیم کر کے صحیح تصوّر کر لیا گیا ہو بلکہ صحیح تصوّرات کو باطل خیالات سے جُدا کر کے سائنس دانوں نے دونوں میں حدِ فاصل قائم کر دی انہوں نے اپنے خیالات کی خاطر ہر قسم کا ایثار قبول کیا۔ ان کو اذیتیں دی گئیں۔ انہوں نے حق کی خاطر عقوبتیں سہیں۔ لیکن وہ حق اور باطل کے امتیاز پر قائم رہے۔ اگر مسٹر گاندھی کے اصول رواداری پر عمل کیا گیا ہوتا تو سائنس کے حقائق کا علم تو درکنار سائنس کی بُنیاد بھی نہ پڑ سکتی اور دماغی ترقی کا کبھی کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ کیا عقلِ سلیم اس بات کو مان سکتی ہے کہ اگر کوئی علمی نظریہ یا سائنس کا اصول سچ ہوتا ہے تو وہ صرف ایک خاص قوم یا فرد کے لئے ہی سچ ہوتا ہے اور اقوامِ عالم

کے لئے سچ نہیں ہوتا؟

حق تو یہ ہے کہ صداقت اور راستی ایک عالمگیر شے ہے خواہ وہ عقل کے ساتھ تعلق رکھتی ہو یا رُوح کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔ اسی طرح عالمِ اخلاق میں اگر کوئی شے بُری ہے تو وہ کسی خاص فرد یا ملک یا قوم کے لئے بُری نہیں بلکہ اقوامِ عالم کے ہر فردِ بشر کے لئے بُری ہے پس جو شے حق ہے وہ کُل عالم کیلئے حق ہے۔ حق کے اصول پر سود وبشی کے اصول کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا ✣

لہٰذا اگر خُدا ہے اور اُس خُدا کا حقیقی عرفان اور مکاشفہ حاصل ہو سکتا ہے تو وہ حقیقی عرفان اور مکاشفہ تمام دُنیا کے کُل ممالک اور اقوام کے ہر فردِ بشر کے لئے حق ہوگا۔ اگر یہ حق ہے کہ خُدا ہمارا باپ ہے۔ اور وہ ہم سے محبت کرتا ہے تو وہ کل بنی نوع انسان کا باپ ہوگا اور اس کی محبت کُل افراد پر حاوی ہوگی۔ اور ایک ہی الہٰی تصوّر تمام بنی نوع انسان کے لئے حق اور درست ہوگا۔ دیگر تمام تصوّرات یا غیر مکمل ہونگے اور یا غلط اور باطل ہونگے۔ اگر خُدا نے اپنے آپ کو انسان پر کامل اور اکمل طور پر ظاہر کیا ہے تو ایسا مکاشفہ اور ظہور کل بنی نوع انسان کے لئے یکساں طور پر صحیح اور درست ہوگا اور کسی خاص قوم یا ملک یا زمانہ کے ساتھ اس کا مختص ہونا امرِ محال ہوگا۔

مسیحیت کا یہ دعویٰ ہے کہ خُدا کا جو مکاشفہ مسیح اور اس کی انجیل میں ہے وہ آخری اور قطعی ہے۔ ہم مسیحی مذہب کو ان معنوں میں قطعی

مانتے ہیں کہ کلمۃ اللہ کے اصُول قطعی طور پر ابد تک صحیح اور راست ہیں اور ان اصُولوں کے اندر بنی نوع انسان لامحدُود روحانی ترقی کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے مطلب کو ایک موٹی مثال سے واضح کر دیتے ہیں۔ علمِ ریاضی کا یہ اصول ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اور یہ اصُول قطعی ہے اور ابد تک صحیح ہے۔ لیکن علمِ ریاضی اس اصُول پر ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ اس اصُول اور دیگر اصُول کی حدُود کے اندر لامحدود ترقی کر سکتا ہے۔ اسی طرح مسیحیت کے بُنیادی اصُول قطعی طور پر حق ہیں کیونکہ ان کا تعلق الہٰی ابوّت و محبت اور انسانی اُخوّت و مساوات و محبّت کے ساتھ ہے اور ہر قوم مُلک زمانہ اور نسل کے افراد اس زینہ کے ذریعہ لامحدود روحانی ترقی کر سکتے ہیں ✣

مسیحیت عالمگیر مذہب ہے

ہم مندرجہ بالا سطور میں ثابت کر آئے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح درست اور راست نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک لازمی امر ہے کہ جو مذہب حق ہو وہ عالمگیر بھی ہو اور اس عالمگیر مذہب کے ہر پیرو کا فرض ہے کہ اس کے پیغام اور اصُول کی تبلیغ کرے ✣

——— (۱) ———

عالمگیر مذہب سے ہماری مراد یہ ہے کہ:۔

اوّل۔ اس مذہب کے اصُول عالمگیر ہوں اور ہر ملک قوم اور زمانہ کے افراد کی رہنمائی کرنے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہ کسی خاص ملک یا قوم یا زمانہ کے ساتھ وابستہ اور مختص نہ ہوں۔ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہوں اور اس بات کے اہل ہوں کہ ہر زمانہ اور

ملک کے حالات پر ان اصُول کا اطلاق ہو سکے۔ یہ اصُول تمام انسانوں پر حاوی ہو سکیں اور دُنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کے افراد ان اصول کی تعمیل کر سکیں اور ہر طرح کے دماغ اور سمجھ والے انسان ان اصُول کے ذریعہ قربتِ الٰہی حاصل کر سکیں ❖

اس مفہوم کا یہ مطلب نہیں کہ اُس مذہب کے اصُول کی کوئی خاص تفسیر یا تاویل عالمگیر ہونی چاہئے چونکہ انسانی علم روز افزوں ہے لہذا اگر کسی عالم نے زمانۂ ماضی میں اُس مذہب کے کسی اصُول کی تاویل اپنے زمانہ کے علم کی روشنی میں کی ہے تو وہ زمانۂ حال یا زمانۂ مستقبل کے علم کی روشنی میں ناقص اور ناکافی ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن اُس مذہب کے اصُول ایسے ہونے چاہئیں کہ ہر زمانہ اور ہر مُلک اپنے وقت کے علم کی روشنی میں ان کی خاطر خواہ تاویل کر سکے۔ تاکہ ان کا اطلاق ہر زمانہ اور ہر مُلک اور ہر قوم کے حالات پر ہو سکے۔ ان اصولوں کی کسی خاص تاویل یا تفسیر کے نقایص اور عیوب سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اصُول خود معیوب ہیں۔ اس سے صرف یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ان اصُول کی پیش نظر تاویل غلط ہے۔ ہاں! اگر وہ اصول اس تاویل کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوں کہ تاویل کو ترک کرنے سے اصُول کا ترک کرنا لازم آتا ہو تو وہ اصُول ہرگز عالمگیر ہونے کی اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھ سکتے کیونکہ اس حالت میں وہ اصُول زمان و مکان کی قیود سے آزاد نہ ہونگے۔ کسی مذہب کے عالمگیر اصُول صرف وہی ہو سکتے ہیں جو انسانی سرشت کی فطرتی ضروریات کو احسن طور پر پُورا کر سکتے ہیں۔ ایسے اصُول میں کسی قوم یا ملک یا زمانہ کی خصُوصی ضروریات کی قید اور

پابندی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ خصُوصی ضروریات عارضی سطحی اور وقتی ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی سرشت کی فطرتی ضروریات بنیادی اور عالمگیر ہیں ❖

دوم۔ عالمگیر مذہب کے لئے لازم ہے کہ اس کے بانی کی شخصیت ایک کامل اور اکمل نمونہ ہو۔ اور یہ نمونہ محض اس کے مُلک یا قوم یا ہم عصروں کے لئے ہی نہ ہو بلکہ ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانہ کے افراد کے لئے ہو۔ بالفاظ دیگر جس طرح عالمگیر مذہب کے اصُول عالمگیر ہونے چاہئیں اُسی طرح اس مذہب کے بانی کا نمونہ بھی عالمگیر ہونا چاہئے۔ عالمگیر مذہب کے بانی کے کیریکٹر میں یہ اہلیت اور صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ ہر ملک اور قوم اور زمانہ کے کروڑوں افراد کا مطمح نظر اور نصب العین ہو سکے۔ جو اُن کی روحانی ترقی کے مدارج اور منازل میں ان کی رہنمائی کا کام بطرز احسن سرانجام دے سکے پس لازم ہے کہ عالمگیر مذہب کے بانی کی زندگی کا نمونہ ایسا کامل اور اکمل ہو کہ وہ کُل دُنیا کا نور ہو تاکہ جو کوئی اس کی پیروی کرے وہ اندھیرے میں نہ چلے۔ بلکہ اس کی روشنی کو دیکھ کر روحانی لغزشوں سے بچا رہے۔ اس بانی کی رُوحانی زندگی نہ صرف ہر پہلو سے بدنما اور معیوب دھبوں سے پاک اور مبرّا ہو (کیونکہ یہ ایک منفی خوبی ہے) بلکہ لازم ہے کہ اس کا کامل نمونہ ہر طرح کی نیکی اور خُوبی کا محرک ہو۔ اس کا نمونہ ایک چشمہ ہو جو نہ صرف لوگوں کی رُوحانی زندگیوں کو سیراب کرنے والا ہو۔ بلکہ سیراب ہونے والوں کے اندر زندگی کے پانی کی ندیاں جاری کردے۔ وہ نہ صرف روحانیت کے عالم کا ایک تاجدار ہو بلکہ وہ واحد تاجدار ہو۔

وہ انبیاء اور اولیاء اور مصلحین کی قطار میں کھڑا نہ ہو جن کی زندگیاں ناکامل اور جن کے نمونے غیر مکمل ہوتے ہیں بلکہ اس کی روحانیت کا نمونہ ہر جہت اور پہلو سے بے نظیر لاثانی اور بے عدیل ہو۔

ع کہ عدیم است عدیلش چو خداوند کریم

سوم۔ عالمگیر مذہب کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف اس کے اصول عالمگیر ہوں اور اس کے بانی کا نمونہ بے نظیر ہو بلکہ وہ اپنے پیروؤں کو یہ توفیق اور فضل بھی عطا کر سکے کہ وہ اپنے بانی کے لاثانی نمونہ کو دیکھ کر اس کے اصول پر عمل پیرا ہونے کے قابل ہو سکیں۔ اگر کوئی عالمگیر مذہب اپنے پیروؤں کو صرف نیک اعمال کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور ان کو یہ توفیق نہیں دے سکتا کہ وہ اس کے عالمگیر اصولوں پر گامزن ہو سکیں تو وہ مذہب عالمگیر نہیں ہو سکتا۔ ایسی مذہبی کتاب کی حیثیت علم الاخلاق کی کتاب سے زیادہ نہیں ہے۔ چہ جائے کہ وہ عالمگیر کتاب کہلانے کی مستحق ہو سکے۔ علم اخلاق بھی یہی تلقین کرتا ہے کہ نیک عمل کرو۔ لیکن نیک عمل کرنے کی توفیق عطا نہیں کرتا وہ ایسے محرکات اور مرغبات بہم نہیں پہنچاتا جس سے نصیحت حاصل کرنے والا نیک اصولوں پر عمل کر سکے۔ علم اخلاق اور شریعت کے ذریعہ انسان کو یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں بات گناہ ہے۔ علم اخلاق کے ذریعہ اس کا گناہ ہونا ظاہر ہو گیا۔ اور شرعی احکام کے ذریعہ گناہ حد سے زیادہ مکروہ معلوم ہو گیا۔ لیکن گنہگار انسان اپنی پلید اور غلیظ عادتوں کے سبب گناہ کے ہاتھ بکا ہوا ہوتا ہے اور جب وہ کسی نیک کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ گناہ کی غلامی کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے۔

اور نہیں کر سکتا۔ بلکہ جس گناہ سے اس کو نفرت ہوتی ہے۔ وہی وہ کر لیتا ہے۔ کیونکہ گناہ اس میں بسا ہوا ہوتا ہے۔ البتہ نیک ارادہ تو اس میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن نیک کام اس سے بن نہیں پڑتے ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہی وجہ ہے کہ گنہگار جس نیکی کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ نہیں کرتا۔ لیکن گناہ کی غلامی کے سبب بدی کو کر لیتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ بدی ہے۔ جب وہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو بدی اس کے پاس آ موجود ہوتی ہے جو عقل کو اندھا کر کے اس کو گناہ کی قید میں لے آتی ہے۔ ایسا انسان دستِ تاسف مل کر پکار اٹھتا ہے کہ ہائے میں کیسا کمبخت آدمی ہوں۔ مجھے اس گناہ کی غلامی اور قید سے کون چھڑائیگا؟ گناہ کی بیماری کا علاج یہ نہیں کہ گناہگار کو نیک اعمال کرنے کی تعلیم دی جائے نیک اصول کا علم اس کو پہلے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس کو ایک نجات دینے والے کی ضرورت ہے جو اس کو گناہ کی غلامی اور قید سے رہائی دے اور اس کو یہ توفیق اور فضل عطا کرے کہ وہ اپنے گناہوں سے مجبور ہونے کی بجائے ان پر غالب آ سکے اور عالمگیر مذہب کے روحانی اصول پر گامزن ہو سکے

ہم اس نکتہ کو ایک مثال سے واضح کر دیتے ہیں۔ ایک شخص موٹر کے نیچے آ جاتا ہے۔ اور اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ ایک اور موٹر پیچھے چلی آتی ہے۔ اب ایک راہ گیر اس بچارے کو آنے والی موٹر کے نیچے کچلے جانے کے خطرہ سے آگاہ کر رہا ہے۔ اس دوسری موٹر کو وہ شخص جو کچلا گیا ہے آتے دیکھ رہا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ راستہ سے پرے ہٹ

جائے۔ اس کو کسی تدبیر کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس کو اُٹھا کر راستہ کی دوسری طرف کر دے۔ اسی طرح گنہگار کو جس کی زندگی گناہ کے ہاتھوں مُردہ ہو گئی ہے عالمگیر مذہب کے اصُولوں کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُن سے تو وہ پہلے ہی آگاہ ہے۔ اُس کو ضرورت اِس بات کی ہے کہ اُس کی رُوح جو مر گئی ہے زندہ ہو جائے۔ اس کو نہ صرف عالمگیر مذہب کے اصُولوں کے علم اور ایک کامل نمونہ کے نورُ کی ضرورت ہے بلکہ اس کو زندگی کی ضرورت ہے تاکہ وہ زندگی کا نُور پائے۔ اس کو فضل کی ضرورت ہے تاکہ توفیق پاکر وہ ازسرِ نَو پیدا ہو کر خُدا کے ساتھ رفاقت حاصل کر سکے۔

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامل   کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

چہارم۔ یہ بھی لازم ہے کہ تاریخ دُنیا عالمگیر مذہب کے دعووں کی تصدیق کرے۔ اگر عالمگیر مذہب کے اصُول فی الحقیقت عالمگیر ہیں تو ضرور ہے کہ جس مُلک اور قوم نے اُس کو قبوُل کیا ہے اُس مُلک اور قوم اور زمانہ کے حالات اس کے عالمگیر اصُولوں سے متاثر ہوئے ہوں۔ اُن اصُولوں نے اُس مُلک اور قوم کو شاہراہِ ترقی پر چلایا ہو۔ اُس مُلک اور قوم اور زمانہ کے باشندوں کی زندگیاں عالمگیر مذہب کے بانی کے کامل نمونہ سے متاثر ہوئی ہوں۔ اور ان باشندوں کو اس مذہب نے یہ توفیق دی ہو کہ گُناہوں سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنے گُناہوں پر غالب آئیں۔ قصّہ کوتاہ جس جس ملک میں عالمگیر مذہب پھیلا ہو اُس مُلک اور قوم کی تاریخ اس بات کی شاہد ہو کہ فی الحقیقت اس مذہب کے اصولوں میں عالمگیر ہونے کی صلاحیت اور اہلیت

موجود ہے۔ عالمگیر مذہب کے دعوے محض زبانی جمع خرچ یا صرف اس کی مذہبی کتاب میں ہی موجود نہ ہوں بلکہ تاریخ بھی اس کے دعووں کی مصدق ہو۔ اگر تاریخ اس کے دعوؤں کی تکذیب کرتی ہے تو وہ مذہب ہرگز عالمگیر نہیں ہو سکتا ✣

(۲)

ہم نے اپنی کتاب "مسیحیت کی عالمگیری" میں اس مضمون پر مفصّل بحث کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عالمگیر مذہب کی مندرجہ بالا تمام خصُوصیات اکمل اور احسن طور پر خُداوند مسیح اور آپ کی تعلیم میں موجود ہیں۔ کلمتہ اللہ بنی نوع انسان کے لئے ایک کامل اور زندہ نمونہ ہے۔ آپ کامل انسان ہیں۔ اور خُدا کا کامل مظہر ہیں۔ آپ جہان کے مُنجی ہیں اور روئے زمین کے کُل گُنہگار انسانوں کو دعوت دیتے ہیں اور اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ شیطان کی غلامی کے جُوئے کو اُتار پھینکے۔ آپ کی تعلیم کے اصُول جامع اور مانع ہیں اور ادیانِ عالم کا کوئی اچھا اصُول ایسا نہیں جو بہترین صورت میں اس میں موجود نہ ہو۔ آپ کی تعلیم کی اساس محبّت اخوّت اور مساوات ہیں۔ آپ نے دُنیا جہان کو زن مرد اور بچّہ کے احترام کا درس دیا۔ ذات پات درجہ بندی اور دیگر امتیازات کا خاتمہ کر دیا اور جس قوم اور مُلک نے آپ کو اور آپ کی تعلیم کو صدق دل سے قبوُل کیا وہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو گئے ✣

(۳)

پس جب مسیحوں کا یہ پُختہ ایمان ہے کہ ان کا مذہب حق پر ہے اور وہ عالمگیر ہے۔ اور وہ دیگر اقوام و ممالک کی رُوحانی ضروریات

کو بھی اُسی طرح پُورا کر سکتا ہے جس طرح اُن کی اپنی روحانی ضروریات پُوری کی گئی ہیں تو ہر مسیحی پر فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے مذہب کے اصُول کی تبلیغ کرے اور دوسروں کو مُنجی کونین کی نجات کی خوشخبری دے تاکہ دوسرے لوگ بھی خداوند مسیح سے فیض یاب ہو سکیں۔ مسٹر گاندھی کا یہ کہنا کہ "اگر مشنری اہلِ ہند کو مسیحیت کا حلقہ بگوش کرنا چاہتے ہیں تو میں ان سے یقینی طور پر کہونگا کہ آپ ہمارے ملک سے رُخصت ہو جائیں" سراسر حق شناسی کے خلاف ہے۔ یہ ہر شخص کا پیدائشی حق ہے جو خُدا کی طرف سے انسانی سرشت میں ودیعت کیا گیا ہے اور ہر شخص پر فرض بھی کیا گیا ہے۔ کہ اگر اس کو کوئی ایسی شے حاصل ہو جائے جو حق ہے تو دوسروں کو اس کی تلقین اور تعلیم دے ٭

ہم اس کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ اگر کسی سائنسدان نے کوئی نئی شے دریافت کی ہے جو اس کے خیال میں صحیح ہے۔ یا اگر کسی فلاسفر نے کوئی نیا نظریہ قائم کیا ہے جو اس کے خیال میں درست اور راست ہے تو کیا اس پر یہ واجب نہیں کہ وہ اہلِ علم پر اور اہل الرائے پر اپنی اس نئی دریافت یا نئے نظریہ کو ظاہر کرے؟ کیا مسٹر گاندھی اس کو یہ کہیں گے کہ تُم خاموش رہو اور حق بات کی تبلیغ مت کرو۔ کیا گاندھی جی گلیلیو۔ ڈارون وغیرہ کو یہ صلاح دیتے کہ گو تُم حق پر اپنے آپ کو خیال کرتے ہو۔ تاہم خاموش رہو۔ تُم کو یہ حق حاصل نہیں کہ تُم کہو کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے یا ارتقا کے اصول کی تلقین اور تبلیغ کرو۔ کیا اس طرزِ عمل سے دُنیا میں علم ترقی کرتا اور آج ہمارے عزیز

ملک ہندوستان کو علم کی روشنی کا زمانہ دیکھنا نصیب ہوتا؟

(۴)

اگر مسٹر گاندھی کے اصُول پر عمل کیا جاتا تو مذاہب کے بانی اور مصلحین اور فلسفہ کے نئے اصُول کبھی معرضِ وجود میں نہ آتے۔ ہمارے ملک یعنی قدیم ہندوستان کے مختلف فلسفیانہ خیالات اور اپنشد اس واسطے ظہور پذیر ہوئے کیونکہ ان کے بانیوں نے برہمنوں کی پروا نہ کی اور رسوم کی پابندیوں کی بجائے حقیقت کی تلاش کرنے کی جرأت کی۔ اگر مہاتما بدھ یہ خیال کرتے کہ ہندوؤں کے لئے اُس زمانے کا ہندو مت کافی ہے تو وہ نروان کے آٹھ نکات کی راہ نہ بتلاتے۔ اگر راجہ اشوک مسٹر گاندھی کی تعلیم پر عمل پیرا ہوتا تو وہ بدھ مت کے مبلغین کو لنکا۔ مصر۔ اور ایشیائے کوچک نہ بھیجتا اور بدھ مبلغین مشرقی ممالک اور چین و جاپان کے دُور و دراز سفروں کی زحمت نہ اُٹھاتے اور یہ ممالک ہندوستان کے خیالات اور کلچر سے بہرہ ور نہ ہوتے۔ شنکر اور رامانج جو جنُوبی ہند میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے خیالات تمام ہندوستان کو متاثر نہ کرتے۔ کیا کبھی کسی سلیم العقل شخص کے وہم و گمان میں بھی آیا تھا کہ راجہ رام موہن رائے کیشب چندر سین سوامی دیانند سرسوتی۔ رام کرشن پرم ہنس۔ یا ویویکانند وغیرہ کی زبان بندی کرے اور ان کو حکم دے کہ اپنے خیالات وغیرہ کا اظہار مت کرو؟

اگر گاندھی جی اپنے قائم کردہ اصُول رواداری کے فلسفیانہ نتیجہ پر خود چلیں تو یہ ظاہر ہے کہ ان کو خود کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ عدم تشدد کے اصُول کی اور دیگر باتوں کی جن کو وہ مانتے ہیں تبلیغ کریں۔ اور لوگوں

تک پہنچانے کے لئے لاکھوں روپیہ پراپیگنڈا میں برباد کریں۔ گاندھی جی کا خود ساختہ اصول دُنیا کے اُن تمام نبیوں، مصلحوں، سائنسدانوں، اخلاقی رہنماؤں کو قابلِ مذمت قرار دیتا ہے جنہوں نے خود حق کو دریافت کرنے پر قناعت نہ کر کے اپنی جانوں کو خطروں میں ڈالا۔ ہر طرح کی ایذا سہی۔ بلکہ جان تک دینے سے دریغ نہ کیا لیکن اس حق کو دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔ یہ اصول انسان کی فطرت کے خلاف ہے کیونکہ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است　　وگر خاموش بنشینم گناہ ست

ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ جب ایک اندھا کسی سرجن کے پاس جا کر اپنی آنکھوں کا اپریشن کرا کے بینا ہو جاتا ہے اور وہ کسی دوسرے اندھے کو دیکھتا ہے تو خاموش ہو کر بیٹھ نہیں رہتا بلکہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ دوسرے اندھے کو بھی اُس سرجن کی خبر دے تاکہ وہ بھی بینائی حاصل کرے۔ افسوس اُس اندھے پر جو بینائی حاصل کر کے خاموش رہے۔ اسی طرح جس شخص نے خداوند مسیح کے قدموں کے پاس آ کر اپنے گناہوں سے نجات حاصل کر لی ہے وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ پولوس رسول فرماتا ہے:۔

"میرے لئے یہ ضروری بات ہے کہ انجیل سناؤں بلکہ مجھ پر افسوس ہے اگر خوشخبری نہ سناؤں۔" "میں یونانیوں اور غیر یونانیوں۔ داناؤں اور نادانوں کا قرضدار ہوں اور ان کو خوشخبری سنانے کو حتی المقدور تیار ہوں۔ اس لئے کہ وہ ہر ایک ایمان لانے والے کے واسطے نجات کے لئے خدا کی قدرت ہے۔" "میرے لئے دعا کرو تاکہ بولنے کے وقت مجھے کلام کرنے کی توفیق ہو تاکہ میں انجیل کو دلیری سے ظاہر کر سکوں جس کے

لئے میں زنجیروں سے جکڑا ہوا ایلچی ہوں اور اس کو ایسی دلیری سے بیان کروں جیسا بیان کرنا مجھ پر فرض ہے"۔

مسیح کی انجیل ایک خوش خبری ہے۔ وہ ایک جلالی حقیقت کا اعلان کرتی ہے "مسیح کی محبت ہم کو مجبور کرتی ہے" کہ ہم اس خوشخبری کا اعلان کریں۔ ہم جو مسیح خداوند کی محبت سے واقف ہو گئے ہیں مجنونانہ وار اس محبت کا اظہار کئے بغیر رہ نہیں سکتے تاکہ دوسرے لوگ بھی "ہمارے ساتھ شریک ہوں"۔ جو لوگ "اس زندگی کے کلام" کو جان گئے ہیں۔ وہ دوسروں کو اس کی خبر دیتے ہیں اور اس کی گواہی دیتے ہیں تاکہ دوسرے بھی اس زندگی میں شریک ہو جائیں (۱ یوحنا ۱)

ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ منجئی کونین اس لئے آئے تاکہ اس دُنیا کے ہر ملک اور قوم کے افراد کو زندگی بخشیں اور "کثرت کے ساتھ بخشیں"۔ ہمارا پکا ایمان ہے کہ خداوند مسیح ہمارے ملک کے افراد کو جماعتوں کو اور ہماری قوم اور ہمارے وطن کو زندگی بخش سکتا ہے اور ہمارے ابنائے وطن کی مُردہ اور خشک ہڈیوں میں زندگی کا مسیحائی دم پھونک سکتا ہے۔ ہمارا پختہ ایمان ہے کہ ہمارے ملک کے بے ہودہ رسوم و رواج۔ توہمات اور معاشرتی تمدنی اور قومی امراض سے وہ ہم کو نجات دے سکتا ہے۔ ہم اپنے تجربہ سے جانتے ہیں کہ منجئی عالمین کی صلیب سے ایک ایسی قوت نکلتی ہے جو ہمارے ابنائے وطن کو زندگی اور شفا بخش سکتی ہے۔ انجیل جلیل کا نصب العین یہ ہے کہ کُل دُنیا کے افراد ابن اللہ کی مانند زندگی بسر کریں۔ ہم جو مسیحی ہیں غیر مسیحیوں کے پاس نجات کا پیغام لے جاتے ہیں تاکہ وہ

مسیح خداوند کی مانند بن جائیں۔ ہم اُن کو یہ پیغام سُناتے ہیں کیونکہ وہ بھی ہماری مانند انسان ہیں۔ پس یہ پیغام ہماری مانند اُن کی ضروریات اور مشکلات کو بھی حل اور پُورا کر سکتا ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہے۔ کہ دُنیا کے افراد ابن اللہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور ہم خُدا کے حضور جوابدہ ہوں گے اگر یہ افراد مُنجی عالمین کا نجات بخش پیغام سُنے بغیر اس دُنیا سے کوچ کر جائیں گے۔ پس اس پیغام کے پہنچانے سے دُنیا کی کوئی طاقت ہم کو روک نہیں سکتی۔

"کون ہم کو مسیح کی محبت سے جُدا کریگا؟ مصیبت یا تنگی یا ظلم یا کال یا ننگا پن یا خطرہ یا تلوار؟ اس کی خاطر دن بھر ہم تلوار سے مارے جاتے ہیں ہم ذبح ہونے والی بھیڑوں کے برابر گنے گئے۔ مجھ کو یقین ہے کہ خُدا کی جو محبت ہمارے خُداوند یسوع مسیح میں ہے اس سے ہم کو نہ موت جُدا کر سکے گی نہ زندگی۔ نہ فرشتے نہ حکومتیں۔ نہ حال کی نہ استقبال کی چیزیں۔ نہ قدرتیں نہ بلندی نہ پستی نہ کوئی اور مخلوق" (روم ۸/۳۵)

بیچارا مسٹر گاندھی کس شمار و قطار میں ہے کہ مسیحی مبلغین کو اس محبت کے اعلان کرنے سے روک سکے۔ مسیحیت کی ابتدا ہی میں حاکموں اور سرداروں نے خُداوند کے شاگردوں کو "بلا کر تاکید کی کہ یسوع کا نام لے کر ہرگز بات نہ کرنا اور نہ تعلیم دینا۔ مگر اُنہوں نے جواب دیا کہ تُم ہی انصاف کرو آیا خُدا کے نزدیک یہ واجب ہے کہ ہم خُدا کی بات سے تمہاری بات زیادہ سُنیں۔ کیونکہ ممکن نہیں کہ جو ہم نے دیکھا اور سُنا ہے وہ نہ کہیں" (اعمال ۴/۱۹-۲۰) دُنیا کے عظیم الشان شہنشاہوں۔ روم کے قیصروں۔ دُنیا کے مختلف ممالک کے گورنروں اور والیوں نے

قہر اور جبر۔ ظلم اور استبداد و جور اور تعدی کے ذریعہ لاکھوں کوششیں کیں کہ مسیحیت کا پرچار نہ ہو۔ لیکن وہ ناکام رہے۔ ان کی سلطنتیں مٹ گئیں۔ ان کا اپنا نام بھی حرفِ غلط کی طرح محو ہو گیا۔ لیکن خُداوند مسیح کی انجیل کی خوشخبری روزِ اوّل سے آج تک ہر ملک و زمانہ کے کروڑوں انسانوں کی رُوحانی ضروریات کو پُورا کرتی رہی اور تا قیامت پُورا کرتی رہیگی۔ یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
مٹتا نہیں ہے لیکن نام و نشاں ہمارا

پس ہندوستان کی کلیسیا بغیر کسی خوف و ہراس کے اپنے نجات دہندہ کے جانفزا پیغام کو ہر کہ و مہ کو سُناتی رہے گی اور نڈر ہو کر اُن تمام حالات و اشخاص کا رُوحانی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر دلیرانہ مقابلہ کریگی۔ جو اُس کو اس مقدس فرض کے سرانجام دینے سے باز رکھنے کی ناکام کوششیں کرینگے۔

باب ششم

تبدیلیٔ مذہب کی ضرورت

ہم باب سوم میں ذکر کر چکے ہیں کہ سیاسی وجوہ کی بنا پر فی زمانہ ہندوستان میں تبدیلیٔ مذہب کو مخالفانہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ فرقہ دارانہ تناسب کی وجہ سے ہمارے ملک کی سیاسیات نے فرقہ دارانہ صورت اختیار کر لی ہے۔ چونکہ اس کمیونل اوارڈ یا فرقہ دارانہ تناسب کی وجہ سے صرف مذہب کے پیروؤں کی تعداد و شمار ہی کی بناء پر ہر ایک فرقہ و ملت اپنے دُنیاوی اقتصادی اور سیاسی حقوق کا مطالبہ کر سکتا ہے اور چونکہ مذہب کی تبدیلی سے ایک فرقے کے شمار میں کمی اور دوسرے کے شمار میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ایک کو ضعف اور دوسرے کو تقویت پہنچتی ہے لہٰذا ہندوستان کا ہر فرقہ یہی کوشش کرتا ہے کہ اس کے مذہب کے پیرو اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے کسی دوسرے مذہب کو اختیار نہ کریں۔ لیکن دوسرے مذاہب کے پیرو اس کے آبائی مذہب میں جوق در جوق داخل ہو جائیں تاکہ اس کے فرقہ کی مردم شماری کی تعداد میں ترقی ہوتی جائے اور رائے دہندگان کی اکثریت کی وجہ سے وہ دیگر

فرقوں سے زیادہ حقوق حاصل کر سکے یوں اُس کے فرقہ و ملت کی اقتصادی ترقی ہو اور وہ دوسرے فرقوں اور گروہوں پر سیاسی غلبہ اور اقتدار حاصل کر سکے۔

پس مندرجہ بالا وجوہ کو زیرِ نظر رکھ کر ہندوستان کے مسلمان اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ہندو اور مسیحی مذہب کے افراد اسلامی کلمہ پڑھ کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں اور جو لوگ اسلام کے دائرہ کے اندر ہیں وہ مرتد ہو کر غیر مسلم مذاہب میں شامل نہ ہوں۔ اس غرض سے اُنہوں نے شریعت بل مجلس قانون سازی سے پاس کروالیا ہے تاکہ مسلمان عورتیں فسخ نکاح کی خاطر غیر مسلم مذاہب میں داخل نہ ہو جائیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہندو اسی کوشش میں ہیں کہ اچھوت ادھار۔ مندروں میں اچھوت کا داخلہ۔ اور اسی قسم کی دوسری اصلاحوں وغیرہ کے ذریعہ اُنہیں کروڑ اچھوتوں کو ہندو فرقہ کے دائرہ میں رکھیں اور شدھی کے ذریعہ غیر ہنود کو ہندو مت کے اندر داخل کر لیں۔ ہندو مصلحین کی ایک کثیر تعداد صرف اس غرض سے اصلاحی کام میں ہمہ تن مصروف ہے تاکہ ان کے سیاسی اقتدار میں فرق نہ آنے پائے۔ جب سرکار برطانیہ نے فرقہ دارانہ تناسب کا اعلان کیا اور مسٹر گاندھی نے دیکھا کہ اچھوت اقوام کو سرکار نے ہندوؤں سے الگ ایک فرقہ تسلیم کر کے ان کو جداگانہ حقوق دے دیئے ہیں اور اس تقسیم کی وجہ سے کروڑوں اچھوت ہندو فرقہ سے الگ شمار کئے جائیں گے جس سے ہندو فرقہ کے دُنیاوی اقتصادی اور سیاسی غلبہ اور اقتدار کو ضعف پہنچے گا

تو آپ نے مرن برت رکھ لیا اور اعلان کر دیا کہ اگر سرکار برطانیہ
نے اچھوت اقوام کو ہندو فرقہ سے جدا ایک مستقل جماعت تصور
کر کے ہندو حلقہ کو تقسیم کر دیا تو میں مر جاؤنگا۔ اس دھمکی کا نتیجہ
پونا پیکٹ ہوا جس سے ہندو اقتدار میں فرق نہ آیا۔ بالفاظ مولانا محمد علی
مرحوم "خلقت خدا کی۔ ملک انگریز کا۔ حکم ہندو مہا سبھا بہادر کا" قائم
رہا۔ اور یوں ع۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

(۲)

مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ ہمارے ہم وطنوں نے
مذہب کو اپنے اپنے فرقہ کی دنیاوی ترقی اقتصادی حشمت سیاسی
غلبہ اور اقتدار کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ ان کو انسانی روح کی بھوک
اور پیاس کی پروا نہیں۔ پس روحانی امور کی طرف سے بے نیاز
ہو کر ہمارے ہندو اور مسلم ہموطن مذہب کو دنیاوی اغراض
کی تحصیل کا آلۂ کار بنا رہے ہیں اور یوں مذہب کی حقیقی علت
غائی کو پس پشت پھینک رہے ہیں۔ خدا اور مذہب کی حقیقی
قدر و قعت اور عزت ان کے سینوں سے جاتی رہی ہے۔ بالفاظ
مقدس پولوس "ان کا پیٹ ان کا خدا ہے"۔ پس ان میں فرقہ وارانہ
ذہنیت پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ ذہنیت اس قدر ترقی کر گئی ہے
کہ نہ ان کو خدا کا خوف رہا ہے۔ اور نہ عقبیٰ کا خیال ان کو ستاتا ہے۔
ہر فرقہ سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ دوسرے فرقے کے حقوق کو بے دریغ
پامال کرے اور اپنی جماعت کا اقتدار بڑھائے۔ پونا پیکٹ کے ذریعہ اہل
ہنود کا اقتدار بدستور قائم رہا اور اس بات پر خوشی کے شادیانے بجائے

گئے۔ لیکن اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبیدکار کو خوب معلوم تھا کہ اس پیکٹ
سے ہندوؤں کی ذہنیت میں کوئی فرق نہیں آئیگا اور وہ اچھوتوں
کو بدستور سابق حقارت کی نظر سے دیکھ کر ان سے حیوانوں کا سا سلوک
کریں گے۔ پس انہوں نے بار بار یہ دھمکی دی کہ اگر ہندو ذہنیت میں کوئی
تبدیلی واقع نہ ہوئی تو اچھوت اقوام کے کروڑوں اشخاص ہندو مت
کو ترک کر کے کسی غیر ہندو مذہب کے حلقہ بگوش ہو جائینگے۔ چنانچہ اگست
۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر امبیدکار اور ہندوؤں کے لیڈر ڈاکٹر مونجی کی خط و کتابت
شائع ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ یہ اصحاب نہیں چاہتے تھے کہ اچھوت
اقوام اسلام کے حلقہ بگوش ہوں مبادا اہل اسلام کی طاقت میں اضافہ
ہو جائے اور نہ وہ چاہتے تھے کہ یہ اقوام مسیحیت کے دائرہ میں داخل ہوں
مبادا برطانوی سلطنت کو تقویت حاصل ہو۔ ان لیڈروں کو یہ خیال نہ
آیا کہ مسیحیت کو برطانوی سلطنت کی تقویت سے کیا واسطہ ہے؟ اچھوت
اقوام کی کروڑوں روحوں کی نجات کا خیال ان لیڈروں کے وہم و گمان
میں بھی نہ آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کو اچھوت اقوام کی دنیاوی ترقی کا بھی خیال
نہیں۔ ہاں اگر پروا ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ہندو فرقہ کی اقتصادی
ترقی طاقت اور سیاسی قوت میں فرق نہ آنے۔ چنانچہ چند سال ہوئے
یو۔ پی کی لیجسلیٹو کونسل میں کانگرس کی حکومت کے دوران میں ایک
واقعہ پیش آیا جس سے ہم عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس صوبہ کے وزیر
تعلیم نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ جس طرح وہ ہندو اچھوت اقوام کے
طلباء کو ان کی مالی ناداری کی وجہ سے سرکاری وظائف دیتے ہیں وہ ان
طلباء کو بھی وظائف دیں گے جو ان اچھوت اقوام سے مسیحی ہو گئے ہوئے

ہیں کیونکہ وہ بھی مالی طور پر نادار ہیں۔ لیکن ہندوؤں نے (جو اچھوت اقوام کی ترقی کی حمایت کے دعویدار ہیں) کونسل میں ایسا طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا کہ وزیرِ تعلیم کو مجبوراً یہ گرانٹ بند کرنا پڑا۔ ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید   جو نہیں جانتے کہ وفا کیا ہے

(۳)

چونکہ ہمارے پولیٹکل لیڈر نہیں چاہتے کہ تبدیلیٔ مذہب سے ان کے فرقوں کی تعداد و تناسب میں ضعف پیدا ہو اور کسی دوسرے فرقہ کو تقویت پہنچے لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ مذہب کے معاملہ میں ایک دوسرے سے رواداری سے پیش آؤ۔ ان کو خدا اور مذہب کی پروا نہیں ہوتی۔ پس وہ محض پولیٹکل وجوہ کی بناء پر مذہبی رواداری کی تبلیغ کرتے ہیں۔ وہ ایک خود ساختہ قضیہ قائم کر کے کہتے ہیں کہ تمام مذاہب میں سچائی موجود ہے۔ لہٰذا تمام مذاہب برابر ہیں۔ پس کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا ہم کو اپنا مذہب تبدیل نہیں کرنا چاہیئے اور ہم اس بات کی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کرے! پس رواداری کی تبلیغ کا نتیجہ عدم رواداری ہو جاتا ہے! جن لوگوں کی زبانوں پر رواداری کا وِرد جاری رہتا ہے وہی رواداری کے حامی اور مبلغین اس بات کی برداشت نہیں کر سکتے کہ لوگ اپنے آبائی مذہب کو ترک کریں۔ مثلاً گاندھی جی مسیحی مبلغین کو کہتے ہیں "اگر آپ ہندوستان کے لوگوں کو مسیحیت کا حلقہ بگوش کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہمارے مُلک سے رُخصت ہو جائیں"۔ ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے   گھُٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

مسٹر گاندھی یہ تو چاہتے ہیں کہ مسیحی مبلغین ہندوستانیوں کی جسمانی اور دُنیاوی ضروریات کو پُورا کرنے میں مدد کریں۔ لیکن مہاتما جی یہ نہیں چاہتے کہ ان کی آتماؤں کی ضروریات کو پُورا کیا جائے۔ کیا مہاتما جی جسم کو رُوح پر مقدم خیال فرماتے ہیں؟ خُداوند مسیح کا حکم صاف ہے کہ

"تم پہلے خدا کی بادشاہت اور اُسکی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائینگی" (متی ۶: ۳۳)

یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مسیحی مبلغین غیر مسیحیوں کو صحت علم اور دانش کے خزانے دے دیں لیکن ان کو خُدا کی بہترین بخشش خُداوند مسیح (یوحنا ۳: ۱۶ - ۱۴: ۶ وغیرہ) سے محروم رکھیں۔ ؎

میرے حق میں اب جو یہ ارشاد فرمایا کہ ہے   خُوب یہاں منقوش خاطر جانفشانی آپکی

لیک میں اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں   رُوکھی پھیکی ایسی سوکھی مہربانی آپ کی

(۴)

مسٹر گاندھی مسیحی مبلغین کو کہتے ہیں کہ تُم اپنی مساعی جمیلہ کو لوگوں کو تعلیم دینے اور ان کا جسمانی علاج کرنے اور ان کی حالت سُدھارنے تک ہی محدُود رکھو اور بس۔ لیکن مسیحی مبلغین اپنے خُداوند اور مُنجی کے احکام کو مسٹر گاندھی سے بہتر جانتے ہیں۔ جب خُداوند مسیح نے اپنی عین حیات میں اپنے حواریوں کو خوشخبری کا پیغام سُنانے کے لئے روانہ کیا تو آپ نے خُدا کی بادشاہی کی مُنادی کرنا سب سے مقدم فرض ٹھہرایا اور حکم دے کر کہا کہ:۔

"جاؤ اور چلتے چلتے یہ مُنادی کرو کہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی ہے۔ بیماروں کو اچھا کرو۔ مُردوں کو جلاؤ۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرو۔ بدرُوحوں کو نکالو۔ تُم نے مفت پایا مفت دوُ"۔ (متی ۱۰: ۷-۸)

پس خُدا کی بادشاہی کی مُنادی دیگر باتوں پر مقدم اور ان سب سے

افضل ہے اور حق تو یہ ہے کہ محض سوشل پروگرام جو روحانی تعلیم سے خالی ہو بے کار ہے۔ اگر مسیحی مبلّغین خدانخواستہ مسٹر گاندھی کی بات پر عمل کریں گے تو لوگوں کو روٹی کی بجائے پتھر اور مچھلی کی بجائے سانپ دیں گے۔ مسٹر گاندھی ہزار بار کہیں کہ ہندوؤں کے لئے ہندوؤں کا مذہب کافی ہے۔ لیکن جن ہندوؤں کی خدا نے آنکھیں کھولی ہیں اور وہ مسیحی نجات سے فیض یاب ہوئے ہیں ان کی یہ گواہی ہے کہ یہ بات سراسر غلط ہے اور وہ قرار نہیں پکڑ سکتے تاوقتیکہ وہ اپنے ہموطنوں کو خداوند کی نجات سے شادنہ کرلیں۔ ع اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

جب مسٹر گاندھی جنوبی افریقہ سے اپنے وطن مالوف میں نئے نئے وارد ہوئے تھے تو آپ نے مدراس مشنری کانفرنس کے جلسہ میں مسیحیت کی اشاعت پر ایک درس دیا تھا۔ آپ نے کھلے اور واضح الفاظ میں فرمایا کہ آپ تبدیلی مذہب کے خلاف ہیں۔ کیونکہ آپ کے خیال میں مذہب کی تبدیلی نیک نیتی سے نہیں کی جاتی بلکہ دنیاوی فوائد کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔ اگر مسٹر گاندھی کو مسیحی طریقۂ تبلیغ سے کچھ بھی واقفیت ہوتی تو وہ اس بات کو جانتے کہ مسیحی مبلغین کسی شخص کو محض دنیاوی طمع اور اغراض کی خاطر مسیحیت کا حلقہ بگوش نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی شخص ان کے پاس اس غرض سے آتا ہے تو کوئی ذمہ دار شخص دیدہ و دانستہ اس کو بپتسمہ دے کر کلیسیا میں شامل نہیں کرتا +

مئی ۱۹۳۶ء میں چودہ تعلیم یافتہ ہندوستانی مسیحیوں نے ایک بیان شائع کیا جس میں اُنہوں نے لکھا کہ:۔

"مرد اور عورتیں فرداً فرداً یا خاندانوں کے خاندان یا گروہوں کے گروہ جوق در جوق مسیحی کلیسیا میں شامل ہوتے ہیں اور یہ خدا کی رُوح کی تحریک کی وجہ سے ہے۔ پس دُنیا کی کوئی طاقت اس لہر کو بند نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ہندوستان کی مسیحی کلیسیا کا یہ فرض ہے کہ وہ اُن لوگوں کو جوق کے متلاشی ہیں قبول کرے۔ اُن کو مسیحی تعلیم دے اور اُن کی رُوحوں کی خبرگیری کرے۔ کلیسیا کا یہ حق ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے حلقہ میں شامل کرے۔ خواہ وہ کسی مذہبی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ کلیسیا کا یہ بھی حق ہے کہ اس مادیت کے دور اور الحاد کے زمانہ میں تمام لوگوں میں روحانی بھوک کے احساس کو بیدار کرے"۔

اس بیان کو پڑھ کر مسٹر گاندھی سیخ پا ہو گئے اور انہوں نے ذیل کے الفاظ حوالۂ قرطاس کئے:۔

"میں نے اس بیان کو ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا ہے اور میں اس کی تائید میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا۔ مرد اور عورتیں مسیحی کلیسیا کی رفاقت کو تلاش نہیں کرتیں۔ اس لحاظ سے غریب ہریجن دوسروں سے بہتر نہیں ہیں۔ کاش کہ ہریجنوں میں سچی روحانی بھوک ہوتی۔ اگر ان میں اس قسم کی کوئی بھوک ہے۔ تو وہ مندروں میں جا کر پوری کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کا وہاں جا کر پرستش کرنا ایک بےمعنی بات ہوتی ہے۔ جب دیگر مذاہب کے مبلغین ان کے پاس جاتے ہیں تو وہ ان کے پاس سودا فروشوں کی طرح جاتے ہیں۔ ان مبلغین کے پاس کوئی خاص روحانی شے نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ان مبلغین میں اچھوتوں میں تمیز ہو سکے۔ ہاں۔ ان کے پاس دنیاوی مال ضرور ہوتا ہے جس کا لالچ دے دے کر وہ ان کو اپنے مذہب میں داخل

ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کے بعد مسیحی کلیسیا کا "فرض" ایک "حق" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جب کوئی "فریضہ" "حق" کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو وہ "فریضہ" نہیں رہتا۔ کیونکہ "فریضہ" کو پورا کرنے کے لئے ایثار اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن "حق" کو حاصل کرنے کے لئے طاقت کے مظاہرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے ذریعہ ہم اپنی مرضی کو دوسروں سے جبریہ منوا سکتے اور قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔ اگر مبلغین اپنے روحانی پیغام کو پہنچانے کا "فرض" ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان کو دعا اور روزہ رکھنا چاہئے۔ لیکن اگر وہ "حق" جتلانا چاہتے ہیں۔ تو وہ غیر رضامند لوگوں پر جبر کرتے ہیں۔ ان مسیحیوں کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں کے جذبات کو ٹھنڈا کرے اور ان کے احساسات کو قدر کی نگاہ سے دیکھے لیکن اس قسم کا بیان اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس ایسے بیان کو پڑھ کر بدمزگی پیدا ہوتی ہے"۔ ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام   وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

(۵)

ہمیں افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر گاندھی مسیحی تحریک سے "کلیتہً" بے خبر ہیں۔ اگر وہ مسیحی طرزِ تبلیغ سے واقف ہونے کی ذرا بھی زحمت گوارا کرتے تو وہ اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ الفاظ نہ کہتے کہ "مبلغین اچھوت اقوام کے پاس سودا فروشوں کی طرح جاتے ہیں ... ان کے پاس دنیاوی مال ہوتا ہے جس کا لالچ دے کر وہ ان کو اپنے مذہب میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں"۔ کسی مہاتما پرش کا کام نہیں کہ وہ اس قسم کے بے بنیاد الزام سے کسی کو مطعون کرے۔ لیکن مسٹر گاندھی

نہایت بے باکانہ طور پر منہ زوری سے کلیسیائے ہند کی جماعت کو بدنام کرتے ہیں۔ ع جرمِ ناکردہ خطاوار بنے بیٹھے ہیں۔ غالباً آپ کا یہ خیال ہے کہ جس طرح وہ اور دیگر ہندو جو اُن کے رفقائے کار ہیں غریب اچھوتوں کو لالچ دے کر سبز باغ دکھاتے ہیں اُسی طرح مسیحی کلیسیا کے مبلغین بھی مسیحی جماعت کی اقتصادی اور سیاسی ترقی کی خاطر ہر ممکن ذریعہ سے اپنی تعداد و شمار کو بڑھانا چاہتے ہیں۔ سچ ہے۔ ع

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

اگر گاندھی جی چاہتے ہیں کہ مسیحی جماعت ان کو سلیم العقل شخص جانے تو ان پر لازم ہے کہ بے سوچے سمجھے اس پر سنگین الزام لگانے سے باز رہیں اور اس قسم کی یادر ہوا باتوں سے احتراز کریں ÷

(۶)

مسٹر گاندھی آخر وکیل ہیں۔ پس وہ مسیحی لیڈروں کے بیان کے الفاظ "فرض" اور "حق" پر وکیلانہ بحث اور جرح کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب مسیحی کہتے ہیں کہ کلیسیا کا یہ "فرض" ہے کہ وہ ہر فردِ بشر کو نجات کا پیغام سنائے تو ان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں پر جبر کر کے زبردستی ان کو مسیحیت کا حلقہ بگوش بنا لیں۔ ایسا مضحکہ خیز رویہ ان کے مذہب کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ مسیحی کلیسیا کا یہ "حق" ہے کہ وہ ان تمام لوگوں کو اپنے دائرہ کے اندر داخل کرے جو منجیٔ کونین پر ایمان لانا چاہتے ہیں۔ اور ان کو تعلیم دے کر ان کی روحوں کی نگہداشت اور پاسبانی کرے۔ اور یہ "حق" کلیسیا کو اس کے خداوند کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ اور اس پر یہ

فرض کر دیا گیا ہے کہ وہ ہر فردِ بشر کو جو ذی روح ہے اُس کی روح کی نجات کا پیغام سنائے اور روئے زمین کی کوئی طاقت کلیسیا کو اس پیغام کے سنانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اور نہ کسی ملک و زمانہ کی عدالت اس فرض کے خلاف کوئی حکم صادر کر کے اُس سے جبریہ منوا سکتی ہے۔

(۷)

حق تو یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم کہیں کہ مسٹر گاندھی ہندی قوم کے حامی نہیں بلکہ ہندو فرقہ وارانہ خیالات کے مؤید ہیں اور فرقہ وارانہ ذہنیت سے خالی نہیں ہیں۔ رع میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔ مسٹر گاندھی بیچارے مسیحی مبلغین کو کمزور سمجھ کر ان کو ملک بدر کرنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ لیکن ان کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اہلِ اسلام کے مبلغین کو زجر و توبیخ کریں۔ حالانکہ وہ جانتے اور مانتے ہیں کہ اہلِ اسلام کی ذہنیت فرقہ وارانہ ہے اور وہ اپنی جماعت کی تعداد کو بڑھانے کی خاطر تبلیغ کا کام سرانجام دیتے ہیں تاکہ وہ ہندوؤں کے اقتصادی غلبہ اور سیاسی اقتدار کو توڑ دیں۔ ان کا محتاط رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ گیدڑ بھبکیاں صرف ایک ایسی جماعت کو سنائی جاتی ہیں جن کو وہ بزعمِ خود کمزور اور ضعیف خیال کرتے ہیں۔ اور آنکھ کھول کر اس حقیقت کو نہیں دیکھتے کہ ہندوستانی مسیحی محبِ وطن اور قوم کے شیدائی ہیں۔ اُن میں فرقہ وارانہ ذہنیت سرے سے ہے ہی نہیں۔ مسیحیت دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ کیونکہ وہ ہر کس و ناکس کی روحانی بھوک کو پورا کرتی ہے۔ مسٹر گاندھی خیال کرتے ہیں کہ غریب "ہریجنوں" کے اندر روحانی بھوک موجود نہیں ہے۔ اس سے

ظاہر ہے کہ درحقیقت ان کے دل میں بیچارے اچھوت ذاتوں کی روحوں کے لئے تڑپ اور درد نہیں ہے۔ چنانچہ جب انٹرنیشنل مشنری کانفرنس (جس کے ماتحت کل دُنیا کی تین سو سے زیادہ پروٹسٹنٹ مشنری سوسائٹیاں ہیں) کے چیئرمین ڈاکٹر موٹ نے (Dr. Mott) ۱۹۳۶ء میں مسٹر گاندھی سے ملاقات کی اور کہا کہ خُداوند مسیح نے ہر مسیحی پر لازم کر دیا ہے کہ وہ اچھوتوں کو انجیل کا پیغام دیں۔ تو مسٹر گاندھی نے جواب میں کہا:-

"ڈاکٹر موٹ۔ کیا آپ گائے بیلوں کو انجیل کا پیغام دے سکتے ہیں۔ اچھوت تو ان حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ ہندو دھرم اسلام اور مسیحیت میں تمیز کر سکیں۔ ان میں سرے سے یہ سمجھ اور عقل ہی نہیں کہ یسوع اور محمد اور نانک وغیرہ میں تمیز کر سکیں۔"

(۸)

مندرجہ بالا الفاظ سے ظاہر ہے کہ مسٹر گاندھی اچھوت اقوام کو بنظر حقارت اور نفرت دیکھتے ہیں۔ اچھوت ادھار کی تحریک سے جیسا ان کے مرن برت سے ظاہر ہے ان کا واحد مقصد یہ ہے کہ ان کو کسی نہ کسی طرح ہندو جماعت سے باہر نہ نکلنے دیں۔ تاکہ ہنود کے اقتدار کو ضعف نہ پہنچے اور ہندوؤں کی کثرت برقرار رہے۔ ~ بے خودی بے سبب نہیں غالب کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے حالانکہ بیچارے اُنہیں کروڑ اچھوت اقوام کسی لحاظ سے بھی ہندو نہیں ہیں۔ نہ ان کی نسل ہندوؤں کی ہے۔ نہ ان کا مذہب ہندوؤں کا مذہب ہے۔ نہ اُن کی تاریخ اور کلچر (ثقافت)

ہندوؤں کی ہے۔ وہ ہندوستان میں ہندوؤں کی آمد سے پیشتر بستے تھے۔ ان کے معبود ہندوؤں کے معبود نہیں بلکہ وہ مذہباً Animist ہیں۔ ہندوؤں کے سوشل نظام میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ کیونکہ ہندوؤں کی صرف چار ذاتیں ہیں اور اچھوت ان چاروں میں سے کسی میں بھی شامل نہیں ہیں۔ پس درحقیقت سرکار برطانیہ حق بجانب تھی۔ جب اس نے فرقہ وارانہ تناسب میں ان کو ہندوؤں سے الگ شمار کیا تھا۔ مسٹر گاندھی نے مرن برت کی دھمکی دے کر ہندوؤں کے اقتدار میں فرق نہ آنے دیا۔ پر غریب اچھوت اقوام کے لئے وہ کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ بڑی سے بڑی بات جو گاندھی جی ان مظلوم اچھوتوں کے لئے کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے ان کو مندروں کے اندر داخل ہونے کی اجازت مل سکے۔ لیکن بفرض محال اگر ان کو یہ اجازت مل بھی جائے تو وہاں داخل ہو کر وہ اپنی روحانی بھوک اور پیاس کو کس طرح مٹا سکیں گے؟ ان مندروں میں سوائے بتوں کے اور رکھا ہی کیا ہے! اور خود یہ مصلحین اس بات کے قائل ہیں کہ بت پرستی ایک ایسا گناہ ہے جو ہندوستان کے حق میں طوقِ لعنت ثابت ہوا ہے۔ ہندوستانی مسیحی مبلّغین یہ چاہتے ہیں کہ بیچارے اچھوت اقوام کے لوگ اپنے اور ہندو مت کے فرسودہ عقائد اور باطل خیالات کو ترک کریں اور تاریکی سے نکل کر آفتابِ صداقت کی روشنی میں زندگی بسر کریں۔ کیا یہ گناہ ہے؟

(۹)

یہاں ایک اور بات قابل غور ہے۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ اچھوت

گائے بیلوں سے بدتر ہیں اور ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ ہندوازم۔ اسلام اور مسیحیت کے عقائد میں تمیز کر سکیں اور یسوع اور محمد اور نانک وغیرہ میں تمیز کرنے کی ان میں سمجھ ہی نہیں"۔ ان الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر گاندھی کے خیال میں ان مذاہب میں درحقیقت فرق عظیم ہے۔ اور ان مذاہب کے بانیوں کی زندگیاں یکساں قدر و منزلت والی نہیں ہیں۔ اور ان مذاہب میں اور ان کے بانیوں میں امتیاز نہ کرنا گویا حیوانوں کا کام ہے۔ ع کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔

ہم مسٹر گاندھی سے یہ سوال کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ اس صورت میں تمام مذاہب کس طرح برابر طور پر حق ہوئے اور ان کے بانی کس طرح یکساں طور پر قدر و وقعت رکھنے والے ہوئے۔ لیکن یہی وہ قضایا ہیں۔ جن کا وہ بار بار اعادہ کرتے رہتے ہیں۔ ع تو آپ اپنے دام میں صیّاد آ گیا

سچ ہے۔ حق بر زبان جاری مے گردد

(۱۰)

اگر مختلف مذاہب میں درحقیقت کوئی فرق نہیں ہے اور وہ سب برابر طور پر درست اور راست ہیں تو مسٹر گاندھی کیوں تبدیلیٔ مذہب کے جانی دشمن ہیں۔ ان کی مخالفت اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ مانتے ہیں کہ ان مذاہب میں حقیقی اور بنیادی اختلافات ہیں۔ اور ان میں تمیز نہ کرنے والا حیوانوں کی سی عقل اور سمجھ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحی کلیسیا اس قسم کے خرافات کو نہیں مانتی اور نہ مان سکتی ہے۔ مسیحیت کا مذہب قطعی اور آخری مکاشفہ ہے جو ادیانِ عالم کے اصولوں کو جانچتا پرکھتا اور ان کی عدالت کرتا ہے۔ وہ اس قسم کا مکاشفہ نہیں جو

دیگر مذاہب میں ہے۔ وہ دیگر مذاہب سے نہ صرف درجہ میں فرق ہے
بلکہ جیسا ہم باب اوّل میں دکھا چکے ہیں ان میں اور اس میں نوعیت
کا فرق ہے۔ دیگر مذاہب مسیحیت کی سی قسم کے مذہب نہیں اور نہ
ان کے بانی خداوند مسیح کی سی قسم کے اشخاص ہیں۔ چونکہ مسیح اور صرف
مسیح راہ حق اور زندگی ہے لہذا دوسرے مذاہب کے بانی راہ حق اور
زندگی نہیں ہو سکتے۔ یہ مسیحی ایمان ہے جس کا ہر مسیحی ایماندار بے دھڑک
ہر فرد بشر کے سامنے اعلان کرتا ہے۔ مسیحیت کے مطابق خدا خود گنہگار
انسان کی نجات کی خاطر پیش قدمی کرتا ہے (یوحنا ۳:۱۶ وغیرہ) کوئی
دوسرا مذہب یہ صداقت اس احسن طریق پر پیش نہیں کرتا۔ مسیحی
طریقۂ نجات ہندو ازم کی طرح کسی انسان کی دماغی اختراع اور بیہودہ
روحانی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ ہندوستانی کلیسیا اس مکاشفہ
کی علم بردار اور منادی ہے۔ جس کا فرض یہ ہے کہ اس حق کا اعلان کرے۔

(۱۱)

مدراس کے ہفتہ وار اخبار گارڈین نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۲۹
فروری سنہ ۱۹۴۰ء میں اس ملاقات کا بیان شائع کیا تھا جو مسٹر سی۔
پی۔ میتھیو نے مسٹر گاندھی سے کی تھی۔ یہ بیان جس کی صحت پر مسٹر
میتھیو اور مسٹر گاندھی دونوں متفق ہیں۔ چند ایک پہلوؤں سے
نہایت معنی خیز ہے۔ کیونکہ اس سے مسیحی کلیسیا کو یہ پتہ لگتا ہے
کہ مسیحیت کی اشاعت اور تبدیلی مذہب کے بارے میں مسٹر
گاندھی کا تازہ نقطۂ خیال کیا ہے۔ مسٹر میتھیو نے مسٹر گاندھی کے
سامنے راسخ الاعتقاد مسیحی نقطۂ نظر پیش کر کے کہا:—

"ہمارا یہ ایمان ہے کہ خدا دنیا میں انسان کی شکل اختیار کر کے آیا اور وہ
انسان یسوع مسیح ہے جو دوسرے نبیوں معلموں۔ اور مذاہب کے بانیوں
کے ساتھ ایک ہی قطار میں نہیں ہے۔ خدا کی نظر میں سب انسان گنہگار
ہیں۔ لیکن صرف یسوع مسیح ہی بے گناہ تھا اور وہ بنی نوع انسان کا نجات
دہندہ ہے۔ اس نے نہ صرف ایک پیغام چھوڑا بلکہ ایک دینی جماعت
بھی قائم کی۔ جس میں اس کے حواری اور سب ایماندار شامل تھے وہ اندرونی باطنی
اور بیرونی ساکرامنٹوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ یہ
ہمارا فرض اور حق ہے کہ تمام لوگوں کو خواہ وہ امیر ہوں خواہ غریب۔
عالم ہوں یا جاہل۔ اونچی ذات کے ہوں یا ہریجن دعوت دیں کہ وہ
مسیح کو اپنا منجی اور خداوند مانیں اور اس کے بدن یعنی کلیسیا کے عضو
بن جائیں۔ یہ کام ہم اپنے اقوال و افعال سے اور اپنی زندگی سے سرانجام
دینا چاہتے ہیں۔ اور یہ ہمارے مذہبی فرائض کا جزو لاینفک ہے۔ اگر ہم
کو ایسا کرنے کی آزادی نہیں تو ہم خیال کرتے ہیں کہ ہم کو مذہبی آزادی
حاصل نہیں۔ کیا اس ہندوستان میں جو آپ قائم کرنا چاہتے ہیں
ہم مسیحیوں کو یہ آزادی ہو گی؟ یا کیا آپ کی قومی گورنمنٹ اس معاملہ
میں ہم کو روکے گی؟"

گاندھی جی نے جواب میں کہا کہ کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہو گی۔
لیکن میں اس قسم کے مذہبی خیالات سے متفق نہیں ہوں پس
میں ایک فرد کے طور پر آپ کے تبلیغی کام کی مخالفت کروں گا جس طرح
آپ کو یہ آزادی حاصل ہے کہ آپ اپنے نقطۂ نگاہ کی اشاعت کریں اسی
طرح مجھے آزادی حاصل ہے کہ میں آپ کی مخالفت کروں

میں نے کہا کہ یہ بات قرینِ انصاف ہے۔ لیکن کیا آپ انجیل کی اشاعت کے خلاف اپنا سیاسی اقتدار کا حربہ استعمال کرینگے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ جو اشاعت خلوصِ نیت سے کی جائیگی ہیں اس میں قانون رکاوٹ کے حائل ہونے کے خلاف ہونگا۔ مسٹر میتھیو نے کہا کہ بعض اوقات ہندو لیڈر اصولاً تبلیغ و اشاعت کی آزادی کے خلاف نہیں ہوتے لیکن کہتے ہیں کہ قومی گورنمنٹ اشاعت کے طریقوں کو جانچیگی اور یوں جو گورنمنٹ مسیحیت کے خلاف ہوگی وہ اس بہانہ سے تبلیغ و اشاعت کو روک سکتی ہے کہ اس سے فرقہ وارانہ نفاق کا یا امنِ عامہ میں خلل کا اندیشہ ہے۔ کیا آپ ہم کو یہ یقین دلوا سکتے ہیں کہ جس طرح ہم کو برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ آزادی حاصل ہے اسی طرح ہم کو قومی گورنمنٹ میں بھی آزادی حاصل ہوگی؟ اس پر گاندھی جی نے کہا۔ کہ:۔

"میں یہ یقین نہیں دلوا سکتا۔ کیونکہ میں ان طریقوں سے ناواقف ہوں جو برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ آپ آزادانہ استعمال کرتے ہیں۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو جائز اور مناسب آزادی دی جائیگی لیکن اگر آپ مجھ سے اس کا مطلب دریافت کریں تو اس کو میں یوں واضح کرتا ہوں کہ اگر آپ اپنے پیغام کی اشاعت کریں تو یہ جائز ہوگا لیکن اگر آپ کسی ہریجن کو خفیہ طور پر گھر لے جائیں۔ اس کو کھانا اور کپڑا دیں اور لالچ دے کر اس کو اپنے مذہب میں داخل کریں تو میں اس کو ناجائز خیال کرتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ ہم مسیحی اپنے غریب بھائیوں کے ساتھ تمام اچھی چیزوں میں خواہ وہ دینی ہوں یا دُنیاوی

حصہ لگاتے ہیں اور اس کو لالچ کہنا غلطی ہے۔ مسٹر گاندھی نے کہا کہ کسی شخص کو دنیاوی مدد دینا اور اپنے مذہب میں داخل کرنا رشوت دینا ہے اور یہ مخربِ اخلاق ہے"۔

—(۱۲)—

ڈاکٹر پرنج پی بھی اسی ہندو ذہنیت کا مظاہرہ یوں کرتے ہیں کہ:
"آپ نے بمبئی لیجسلیٹو کونسل میں تبدیلئ مذہب کی قانونی روک تھام کے لئے ایک بل تیار کیا تھا جس کی رُو سے تمام مذہبی تبدیلیاں جو دغا یا فریب یا جبر سے عمل میں آئیں سزا کا مستوجب ہوں گی۔ جماعتوں اور مجنوں اور نابالغوں کو قانوناً تبدیلئ مذہب سے روکا جائے گا۔ ہر شخص کو تبدیلئ مذہب کی اجازت ہوگی۔ بشرطیکہ وہ بیمار یا مفلس نہ ہو یا اس کا دماغ کمزور نہ ہو۔ اس بل کے مطابق مذہب کی تبدیلی کو مجسٹریٹ رجسٹر کریگا۔ اور مجسٹریٹ کو خاص طور پر یہ خیال رکھنا ہوگا کہ تبدیلی صرف مذہبی اصُول کی وجہ سے عمل میں آئے اور مذہب کو تبدیل کرنے والا اپنے قول اور فعل کے اونچ نیچ کو اچھی طرح سے سمجھتا ہو"۔ (انڈین سوشل ریفارمر ۱۰ مئی ۱۹۴۰ء)

—(۱۳)—

مسٹر گاندھی کے مندرجہ بالا بیان کے متعلق مسیحی کلیسیا کو ذیل کے امور مدِّ نظر رکھنے چاہئیں:۔

اوّل۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ وہ مسٹر میتھیو کے تصورِ مسیحیت کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے جس سے ان کا یہ مطلب ہے کہ وہ مسیحیت کے کسی ایسے تصور کے ساتھ متفق نہیں جو کلمۃ اللہ کو خدا کا آخری

قطعی اور کامل و اکمل مکاشفہ مانے ۔ مسٹر گاندھی کو اختیار ہے کہ خداوند مسیح اور مسیحیت کی نسبت جو چاہیں مانیں ۔ لیکن ان کا ذاتی عقیدہ مسیحی عقیدہ کو بدل نہیں سکتا ۔ اس ملاقات سے مسٹر میتھیو کی غرض یہ نہیں تھی کہ مسٹر گاندھی مسیحی کلیسیا کو یہ بتلائیں کہ وہ کیا مانے ۔ چونکہ مسٹر گاندھی اہل ہنود کے چوٹی کے لیڈر ہیں اس واسطے ان سے ملاقات کرنے کا یہ مقصد تھا کہ اہل ہنود جن کی ہمارے ملک میں اکثریت ہے مسیحی عقائد اور مسیحیت کی اشاعت اور تبدیلیٔ مذہب کو سیاسی نکتۂ نگاہ سے کس نظر سے دیکھتے ہیں ۔

صحیح سیاسی نکتہ نگاہ سے ان سوالات کا جواب ظاہر ہے جمہوریت کے اصول کے مطابق ہر شخص آزاد ہے کہ وہ بے خوف ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرے اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے اصول کی تبلیغ کرے ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ آزادی کسی دوسرے شخص کے خیالات کے اظہار و تبلیغ کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو ۔ اگر اس قسم کی آزادی کا انکار کیا جائے تو جمہوریت کے اصول محض ایک ڈھکوسلہ رہ جاتے ہیں ۔ مثال کے طور پر اسلام اور ہندومت کے بعض مبلغین امریکہ یا برطانیہ میں جاتے ہیں ۔ اور وہاں اسلام یا ویدانت کی تبلیغ کرتے ہیں ۔ لیکن ان ممالک میں کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا کہ قانون کے ہتھیار سے ان تبلیغی کوششوں کی روک تھام کرے ۔ کیونکہ ان ممالک کے لوگ جمہوریت کے شیدائی ہیں ۔ جن کے لئے آزادی کے اصول محض زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ ان ممالک میں آزادی کے اصول ان کی سیاسیات کی بنیاد ہیں ۔ جمہوری اصول کے مطابق ہر شخص آزاد ہے کہ وہ اپنے مذہب یا لامذہبی

کے اصول کی یا کسی فلسفہ یا مجموعہ خیالات کا اظہار و تبلیغ کرے اور اُن پر عمل بھی کر سکے ÷

(١٤)

پس مسٹر گاندھی بجا کہتے ہیں کہ مسیحیت کی جو تبلیغ خلوص نیت کے ساتھ کی جائے اس پر کوئی قانونی یا سیاسی قید نہیں لگ سکتی ۔ لیکن مطلب سعدی دیگر است ۔ الفاظ "خلوص نیت" کے پردے اور آڑ میں ضمیر کی آزادی اور مذہب کی آزادی کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹ ڈالی جا سکتی ہے ۔ یہ کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں شخص اپنے خیالات کا اظہار اور ان کی اشاعت "خلوص نیت" سے کر رہا ہے ۔ اور فلاں "خلوص نیت" سے نہیں کرتا ہے سیاست دان کا کام "نیت" سے نہیں بلکہ ملک کے انتظام سے ہے تاکہ کوئی شخص کسی دوسرے کے جائز حقوق اور آزادی میں مخل نہ ہو ۔ ورنہ حاکم وقت کو ایک محکمۂ احتساب قائم کرنا پڑے گا جو جمہوریت کے منافی ہے ÷

(١٥)

جو بیان شائع کیا گیا ہے اُس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "مبلغین" سے گاندھی جی کا مطلب پردیسی مبلغین سے ہے ۔ آپ بھول جاتے ہیں کہ ہندوستان میں لاکھوں مسیحی بستے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک مسیحی کا یہ اوّلین فرض ہے کہ وہ مسیح اور مسیحیت کی تبلیغ کرے ۔ اور اِن لاکھوں ہندوستانی مسیحی مبلغین کا یہ حق ہے کہ وہ ہندوستان میں بود و باش کریں جس طرح کروڑوں ہندوؤں کا یہ حق ہے کہ وہ ہندوستان میں سکونت کریں ۔ کیونکہ دونوں کی جنم بھومی ایک ہی ہے ÷

اگر بدیسی مبلغینِ مسیحیت پر قانونی قیود عائد کی جائیں گی تو وہ قیود ہندوستانی مسیحیوں سے اُن کا حقِ تبلیغ چھین نہیں سکتیں۔ اور اگر کوئی قانونی پابندی عائد کی گئی تو ہر ہندوستانی مسیحی کا فرض ہوگا کہ وہ ایسے خلافِ مذہب قوانین کی خلاف ورزی کرے ۔

(۱۶)

مہاتما جی کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر اشاعت و تبلیغ پر پابندیاں عائد کی گئیں تو یہ پابندیاں نہ صرف مسیحیوں پر ہی عائد ہونگی بلکہ آریہ سماج اور اسلام بھی ان کے ماتحت ہونگے اور اُن کو بھی یہ اختیار نہیں ہوگا کہ کسی مسیحی کو ہندو دھرم یا اسلام میں داخل کریں۔ کیا اس قسم کی قانونی پابندیاں فرقہ دارانہ جھگڑوں کا خاتمہ کرنے اور قوم کو یک جا کرنے کی بجائے نت نئے جھگڑے برپا کرنے اور قوم کا شیرازہ بکھیرنے کا باعث نہ ہونگی؟

(۱۷)

گاندھی جی کہتے ہیں کہ "تم کو مناسب آزادی دی جائیگی"۔ کیا ایک مہاتما پرش کو یہ سجتا ہے کہ اس قسم کے تحکمانہ انداز کو اختیار کرے؟ ابھی تو اصل خیر سے ملک کو آزادی بھی حاصل نہیں ہوئی اور مہاتما جی خیال کرتے ہیں کہ مسیحیت اُن کی مٹھی میں ہے۔ اس کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کو تو صرف ایک موہومہ اختیار حاصل ہے کہ مسیحیت کے ساتھ جو چاہیں کریں لیکن ہندوستان کے لاکھوں مسیحیوں کو یہ حقیقی اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے فرض کو پہچان کر مسٹر گاندھی جیسے مہاتما پرشوں کی لن ترانیوں کی پروا نہ کرکے ہندوستان

کو مسیح کا حلقہ بگوش بنا دیں ۔

ہم حیران ہیں کہ جب ہم اپنی روزمرّہ زندگی میں ایک شے کو پسند کرکے قبول کرتے اور دوسری کو ناپسند کرکے ردّ کرتے ہیں تو مذہب جیسے اہم معاملہ میں جو درحقیقت زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ہم کو سچے اصولوں کو پسند کرنے اور باطل اصولوں کو ترک کرنے سے کیوں روکا جاتا ہے؟

مسٹر گاندھی لفظ "مناسب آزادی" کو یوں واضح کرتے ہیں "تم کو یہ اختیار ہے کہ اپنے پیغام کی تبلیغ کرو۔ لیکن اگر تم خفیہ طور پر کسی ہریجن کو اپنے گھر بلا کر کھانا اور کپڑا دو اور اس کے لالچ کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر اس کو مسیحی بناؤ تو مَیں اس قسم کے فعل کو خلافِ قانون سمجھونگا"۔ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ مسٹر گاندھی جیسے دل و دماغ رکھنے والے مسیحیت کی تبلیغ کی نسبت کس قسم کے خیالات رکھتے ہیں؟ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت میں "خفیہ" مساعی کو کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔ آپ نے غریب ہریجن کو ایک "لالچی شخص" بنا دیا ہے۔ جس کو ہریجن سیوا سنگھ اور مسیحی کلیسیا دونوں اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور جو کھانے اور کپڑے پر اتنا مرتا ہے کہ اُن پر اپنے مذہب کو قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یا شاید گاندھی جی کا خیال ہے کہ مسیحی مبلغین ہریجن کو "خفیہ طور پر" اغوا کرکے اپنے گھروں میں لے جا کر بپتسمہ دے دیتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ گاندھی جی کی ناواقفیت اور قوتِ متخیلہ ان سے کیا کیا مضحکہ خیز کلمات کہلوائیگی۔ چنانچہ آپ ایک اور مثال دیتے ہیں۔ "فرض کرو کہ آپ خفیہ طور پر ایک شخص کو سیلون سے ٹراونکور بھگا کر لے جائیں"۔ مہاتما جی بھول جاتے ہیں کہ مسیحی مبلغین اغوا کرنے والوں کی جماعت نہیں ہے۔ اور جس قسم کی حرکات کا

غیر مسیحی لیڈروں نے ۱۹۲۰ء میں نان کواوپریشن کے زمانہ میں ارتکاب کیا تھا اور نابالغ بچوں اور بے سمجھ نوجوانوں کو سکولوں اور کالجوں سے نکالا تھا۔ اور یوں اُن کی بے سمجھی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا تھا اس قسم کی حرکات مسیحی مبلغین سے سرزد نہیں ہوتیں اور وہ نابالغوں کو نکال بھگا کر نہیں لے جاتے۔

ہم مسٹر گاندھی اور اُن کے ہم خیالوں کو ایک تازہ واقعہ یاد دلاتے ہیں گذشتہ سال (۱۹۳۶ء) میں حیدرآباد کی ریاست کے شمال مشرقی حصہ میں سخت قحط پڑا۔ گورنمنٹ نے ان قحط زدوں کی امداد کرنے میں کاہلی سے کام لیا۔ پس وہاں کے مشنریوں نے اس کارِ خیر کو شروع کیا اور وہ سرکاری افسروں۔ تاجروں۔ زمینداروں سے قحط زدوں کی امداد کے خواہاں ہوئے لیکن باستثنائے چند افراد کسی نے ان کی اپیل کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ لیکن یہ بلند ہمت مشنری اس قسم کے رویہ سے اپنے عزم بالجزم سے باز نہ آئے اور انہوں نے ان قحط زدہ بیچارگاں کی امداد کا تہیہ کر لیا۔ اور پانچ مرکزوں میں پانچ ہزار آدمیوں کو چھ ماہ تک روزانہ کھانا کھلاتے رہے۔ غیر مسیحی برادران کے رویہ کے خلاف وہ حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ لائے۔ انہوں نے ان قحط زدہ اشخاص کو کبھی نہ کہا کہ "دیکھو تمہارے ہم مذہبوں نے تمہاری پرواتک نہیں کی۔ تمہارے دیوتاؤں نے تمہاری دعاؤں کو نہیں سنا۔ گورنمنٹ نے تمہاری مدد نہیں کی۔ سرمایہ دار تاجروں اور زمینداروں نے تم کو نہیں پوچھا۔ صرف مسیحیوں نے تمہاری امداد کی ہے"۔ مسٹر گاندھی کے خیال کے مطابق وہ ہزاروں کو بپتسمہ دے کر مسیحیت کے حلقہ بگوش کر سکتے تھے لیکن انہوں نے قحط زدہ اشخاص کی ضروریات کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا۔ اور ایک

شخص کو بھی بپتسمہ دے کر مسیحی جماعت میں شامل نہ کیا۔

(انڈین سوشل ریفارمر بابت ۲۳ مارچ ۱۹۳۷ء)

ے خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

(۱۸)

مسٹر گاندھی ہندوستانی مسیحیوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم خاموش مسیحی زندگی بسر کرو اور اس زندگی سے اپنے ہم وطنوں پر اثر ڈالو لیکن انجیل جلیل کا سرسری مطالعہ ہم پر یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ یہ مشورہ خداوند کی منشاء کے خلاف ہے۔ جب ہم کلمتہ اللہ کی زندگی اور نمونہ پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ گو خداوند مسیح کی زندگی کامل تھی تاہم آپ نے اپنے کامل نمونہ دینے پر اکتفا نہ کی۔ آپ نے اپنی کامل زندگی کے خاموش پیغام پر کبھی قناعت نہ کی۔ کوئی مسیحی خداوند کی سی کامل زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کوئی "شاگرد اپنے استاد سے بڑا نہیں ہوتا" (متی ۱۰/۲۴) پس جب کلمتہ اللہ نے کامل نمونہ ہونے کے باوجود خاموش زندگی پر قناعت نہ کی (مرقس ۳/۲۸ وغیرہ) حالانکہ ہزاروں اشخاص آپ کے نمونہ سے متاثر تھے (مرقس ۵/۲۱۔ متی ۵/۱۔ یوحنا ۶/۵ وغیرہ) تو ما و شما جن کی زندگیاں غیر مکمل ہیں کس طرح محض خاموش گواہی پر قناعت کر سکتے ہیں؟ کتاب اعمال الرسل سے ظاہر ہے کہ خداوند مسیح کے رسولوں نے یہ وطیرہ کبھی اختیار نہ کیا۔ بلکہ خود کلمتہ اللہ نے اور آپ کے رسولوں نے اپنے پیروؤں پر یہ فرض کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے افعال سے اپنے مسیحی کو ظاہر کریں بلکہ اپنے اقوال سے اس کا اقرار کریں (متی ۱۰/۳۲۔ رومی ۱۰/۹) پس ہم کلمتہ اللہ کے احکام

کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے مسٹر گاندھی کے مشورہ کو مردود سمجھتے ہیں۔

ع اگر بینم کہ نابینا و چاہ است دگر خاموش بنشینم گناہ است

خدا کا حکم ہے "گلا پھاڑ کر چلا۔ دریغ نہ کر۔ نرسنگھے کی مانند اپنی آواز بلند کر اور لوگوں پر ان کے گناہوں کو ظاہر کر" (یسعیاہ ۵۸/۱) مسٹر گاندھی کے برعکس مقدس پولوس صاف طور پر فرماتے ہیں۔ "ایمان سننے سے پیدا ہوتا ہے لیکن جس کا ذکر انہوں نے نہیں سنا اس پر ایمان کیونکر لائیں اور بغیر منادی کرنے والے کے کیونکر سنیں"؟ (روم ۱۰/۱۴) خود خداوند مسیح اور آپ کے رسول مشنری اور مبلغ تھے۔ (مرقس ۱/۳۸ و لوقا ۴/۴۳ وغیرہ) اگر آپ کے مبارک رسول صرف خاموش زندگی بسر کرنے پر ہی قناعت کرتے اور منادی کرنے کا فرض (اعمال ۸/۴ وغیرہ) ادا نہ کرتے تو مسیحی کلیسیا کبھی معرضِ وجود میں نہ آتی۔ مسیحیت کی اشاعت کی وجہ یہ تھی کہ منجی کونین کے شاگرد نجات کی بشارت کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتے تھے (افسی ۶/۲۰ روم ۱۵/۲۰ وغیرہ) اور انجیل کی منادی کے حکم کی تعمیل کرنا سعادت دارین کا باعث خیال کرتے تھے (متی ۲۸/۱۸-۲۰ - ۱۰/۱۸ - لوقا ۲۴/۴۷-۴۹ - یوحنا ۲۰/۲۱-۲۳ - ۲۱/۲۱-۲۳ - ۲۴/۴۷ - اعمال ۱/۸ وغیرہ) جب ہم نے خدا کی محبت کا جو مسیح میں ہے ذاتی تجربہ کر لیا ہے اور خدا کی نجات سے بہرہ ور ہو گئے ہیں تو ہم کس طرح خاموش رہ کر لاکھوں انسانوں کو لاپروائی سے ہلاکت کی طرف جاتے دیکھ سکتے ہیں کیونکہ "گناہ کی مزدوری موت ہے"؟ (روم ۶/۲۳) ان گناہگاروں کو بھی اُسی اطمینان اور شانتی کی ضرورت ہے جو ہم کو حاصل ہو گئی ہے۔ پس جو شخص جان بوجھ کر ایسے انسانو

کو "اس بخشش سے جو ہمیشہ کی زندگی ہے" (روم ۶/۲۳) محروم رکھتا ہے وہ اپنے افعال سے ثابت کر دیتا ہے کہ اس نے الٰہی محبت کا تجربہ نہیں کیا۔ کیونکہ محبت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی خوشی میں شریک کرتی ہے (۱۔ یوحنا ۱/۳) پس کوئی شخص الٰہی محبت و نجات کی بخشش کو حاصل کر کے خاموش نہیں رہ سکتا۔ منجی کونین کا یہ حکم ہے کہ "تم نے مفت پایا مفت دو"۔ پس مسیحی ہونا اور مسیحیت کا مبلغ ہونا درحقیقت مترادف الفاظ ہیں۔ ع

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن

ہر مسیحی ایماندار منجی کونین کی نجات کا مبلغ ہے۔ چونکہ اس نے خداوند مسیح کی محبت کے مطلب اور مقصد کو جان لیا ہے اور اس بات کا تجربہ کر لیا ہے کہ خدا نے اپنی بے قیاس محبت سے مجھ گنہگار کو تلاش کیا ہے (لوقا ۱۵ باب) لہٰذا یہ میرا فرض ہے کہ میں دوسرے گنہگاروں پر بھی یہ ظاہر کر دوں کہ خدا کی لازوال محبت ان کی بھی تلاش کرتی ہے (یوحنا ۳/۱۶ وغیرہ) کلمتہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "میں اس لئے آیا ہوں کہ انسان زندگی پائیں اور کثرت سے زندگی پائیں"۔ (یوحنا ۱۰/۱۰) ہر ہندوستانی مسیحی عاجزی سے خدا کا شکر کرتا ہے کہ اس کو زندگی ملی ہے (یوحنا ۱/۱۲ وغیرہ) پس اس کی خلوص نیت سے یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہموطنوں کو جو مردہ ہیں اس نجات کا پیغام دے "تاکہ وہ بھی کثرت سے زندگی پائیں" اور ہمارے ملک و قوم ہند کی ترقی ہو۔ ہم مسیح کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے (یوحنا ۱۵/۱۵) اور ہم اس کی برداشت نہیں کر سکتے کہ اس کے بغیر اس دنیا کا کوئی شخص بھی زندگی بسر کرے۔ ہم

جو مسیحی ہیں ایسی دُنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتے جس میں ایسے انسان بستے ہوں جو گُنہگار ہوں اور جن کی رُوحیں پیاسی ہوں اور وہ آبِ حیات (یُوحنا ۴) سے محروم رکھے جائیں۔ جب خُدا نے انسان کی نجات کا انتظام کیا تو اُس نے کسی ملک یا قوم یا فرد کو اُس سے مستثنےٰ نہیں کیا۔ ہم کون ہیں کہ ہم خاموش رہ کر اس نجات کے پیغام سے دوسروں کو محروم کریں؟ یہ زندگی کا پیغام ہمارا نہیں کہ ہم کو اختیار ہو کہ اس کا اعلان کریں یا نہ کریں۔ مسیحی نجات کی پیغام بری کا حکم خود پیغام کے اندر مُضمر اور موجود ہے۔ نجات کا یہ پیغام الٰہی پیغام ہے اور خُود خُدا نے ہمارے سپرد کیا ہے۔ اور خُدا کے حکم کے سامنے ہم مسٹر گاندھی کے مشورہ کو کہ خاموش مسیحی زندگیوں سے دُنیا کو متاثر کرو بے حقیقت سمجھتے ہیں +

مسٹر گاندھی کانگرسی خیالات کے پرچار کے معاملہ میں کیوں اپنی اصلاح پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ کانگرس کے اخبارات کیوں جاری ہیں کانگرس کے کارندے کیوں خاموش زندگیاں بسر کرنے پر قناعت نہیں کرتے؟ مسٹر گاندھی آج کل تقریر کی آزادی کی خاطر کیوں گورنمنٹ سے اُلجھ کر ہزاروں کو جیل خانہ بھیج رہے ہیں؟ خُداوند مسیح کا نمونہ اور آپ کے سُنہری اصُول ہم کو دُنیا کے تمام سیاسی مفکرین کی دریوزہ گری سے بے نیاز کر دیتے ہیں +

(۱۹)

حق تو یہ ہے کہ تبدیلیٔ مذہب کے بارے میں ہمارے غیر مسیحی ہم وطن ایک ایسا وطیرہ اختیار کرتے ہیں جو تنگ دلی بے انصافی اور تعصب پر مبنی ہے۔ ایک طرف تو وہ اُن اشخاص کو اپنی جماعت سے

خارج کر دیتے ہیں جو مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں اور لطائف الحیل سے ان پر ظلم و ستم کر کے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں اور ایذائیں دے دے کر ان کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ان کی جماعت سے نکل جائیں۔ دوسری طرف وہ دھمکیاں دے کر کہتے ہیں کہ اپنی الگ جماعت قائم نہ کرو۔ اگر تم نے الگ ایک فرقہ بنا لیا تو تم فرقہ پرست ہو گے تم ایک اقلیت ہو ہماری اکثریت ہے اور یُوں اپنی اکثریت کے غلبہ اور اقتدار سے مسیحی کلیسیا کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ ؎

الاماں از روحِ گاندھی الاماں　　الاماں از گاندھیانِ این زماں

مذہبی رواداری کے مبلغ اپنے قول کے خلاف تعصب سے کام لے کر ہم کو جماعت سے خارج کر کے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کے قول اور فعل میں مطابقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گو مسیحی مبلغین ایسے طریقے استعمال کرتے ہیں جن کا جائز ہونا عدالت میں بھی ثابت ہو سکتا ہے تو بھی غیر مسیحی تبدیلیٔ مذہب کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ فرقہ دارانہ تناسب کی وجہ سے ہر فرقہ کا سیاسی وقار اس کی تعداد پر منحصر ہو گیا ہے۔ پس یہی مذہبی رواداری کے وکیل اس بات کی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص اپنے مذہب کو تبدیل کر کے مسیحی ہو کر ان کے سیاسی اقتدار میں خلل ڈالے۔ حالانکہ انہی غیر مسیحی وکلائے رواداری کے طرزِ عمل کی وجہ سے مذہب کی تبدیلی ایک جماعت سے نکل کر دوسری جماعت میں داخل ہو کر ہی ہو سکتی ہے۔ اس کا صحیح علاج یہ نہیں کہ وہ نو مریدوں کو نت نئی دھمکیاں دیں اور مشنریوں کو تنگ بدر کرنے کی بڑیں ہانکیں۔ واجب تو یہ تھا کہ مسٹر گاندھی اور کانگرس مسیحیوں کی طرح فرقہ دارانہ تناسب

جیسے تباہ کن اصول کو سرے سے رد کر دیتے پر انہوں نے اُس کو قومی مفاد کے خلاف تسلیم کرنے کے باوجود اپنی فرقہ وارانہ ذہنیت کی وجہ سے رد نہ کیا غیر مسیحیوں کو چاہئے کہ وہ اپنا طرزِ عمل بدلیں تعصب اور تنگدلی کو چھوڑ کر فراخدلی اور حقیقی رواداری اختیار کریں اور نومریدوں پر ظلم و ستم کر کے ان کو اپنی جماعت سے خارج کرنے کے عوض ان کو مذہبی آزادی دیں تاکہ ان کو ضمیر اور مذہب کی کامل آزادی حاصل ہو اور ان کو یہ حق ہو کہ بغیر کسی قسم کی روک ٹوک کے وہ جماعت سے خارج ہوئے بغیر جس مذہب کو چاہیں قبول کریں۔ اور دوسروں میں آزادانہ اپنے خیالات کی تبلیغ کر سکیں۔ اگر ہمارے غیر مسیحی برادران موجودہ رویہ کو اختیار نہ کرتے اور عقائد کی وجہ سے مسیحیوں پر جبر اور تشدد روا نہ رکھتے تو مسیحیوں کو اپنے گھر خاندان اور جماعت سے نکلنے کی ضرورت نہ پڑتی اور نہ مسیحی جماعت کے الگ وجود کی ضرورت پڑتی بلکہ جس طرح لنکا چین و جاپان کے مسیحی منجی کونین کے حلقہ بگوش ہو کر اپنے آبا و اجداد اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ ایک ہی جماعت میں رہ کر بود و باش کرتے ہیں ہندوستانی مسیحیوں کو بھی اپنے گھروں کو خیرباد کہنے کی نوبت نہ آتی۔ ہندوستان میں مسیحی جماعت کا وجود ہمارے غیر مسیحی برادران کی تنگ دلی کا نتیجہ ہے۔ ع ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

ہمارے غیر مسیحی برادران مسیحی نومریدوں کو اپنی ذات برادری جماعت سے خارج کرنے پر ہی قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ جب ان کو مسیحی جماعت میں قبول کر لیا جاتا ہے تو مسٹر گاندھی کی طرح طعنے دینے شروع کر دیتے ہیں کہ مسیحی مبلغین دُنیاوی مال کا لالچ دے کر ان کو مسیحی جماعت میں شامل کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ خیال نہیں

کرتے کہ وہ غریب انکے مذہبی تعصبات کی وجہ سے بے خانماں اور بے سروسامان ہو جاتے ہیں۔ اور اگر مسیحی کلیسیا اس حالت میں اُن کی مدد نہ کرے تو وہ کیا کریں اور کہاں جائیں؟

؎ پر کتر کر مجھے کہتا ہے کہ اس جا سے نکل جا ایسی بے پر کی اُڑاتا نہ تھا صیاد کبھی

غالباً یہ الزام اس غرض سے وضع کیا گیا ہے تاکہ مسیحی مبلغین اس الزام سے خوف کھا کر کسی شخص کو جو مذہب کی وجہ سے اپنے خاندان اور ذات برادری سے خارج کیا جائے مسیحیت میں قبول نہ کریں اور یوں اس چال سے مسیحیت کی اشاعت بند ہو جائے۔

مسٹر گاندھی کو یاد رکھنا چاہئے کہ کلیسیا کا فرض ہے کہ ایسے بے سر سامان اور بے خانماں شخص کی مدد کرے جو اہل ہنود کی تنگدلی اور کم ظرفی کی وجہ سے لاچار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خداوند مسیح نے فرمایا ہے کہ:-

"جو بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے۔ پیاسوں کو پانی پلاتا ہے۔ پردیسیوں کو اپنے گھر میں اُتارتا ہے۔ ننگوں کو کپڑا پہناتا ہے۔ بیماروں کی خبر گیری کرتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ نیک سلوک نہیں کرتا۔ بلکہ خود خداوند مسیح کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے۔" (متی ۲۵ باب)

اگر یہ کہا جائے کہ مسیحی کلیسیا اچھوت ذات کے لوگوں کو بہتر سلوک کی تحریص و ترغیب دے کر ان کو مسیحیت کا حلقہ بگوش کرتی ہے تو ہم یہ جواب دیں گے کہ مسیحی اُخوت و مساوات کے اصول کل بنی نوع انسان پر حاوی ہیں اور یہ مسیحیت کا امتیازی نشان ہے کہ مسیحیت میں ہر قسم کی امتیازات دُور ہو جاتی ہیں اور برہمن اور شودر ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہ کر آپس میں برادری کے رشتہ میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ ہم اچھوت اُدھار کے حامی مسٹر گاندھی سے پوچھتے ہیں کہ

کیا آپ آریہ سماجیوں کو یہ کہہ کر منع کریں گے کہ اگر اچھوت آریہ سماج میں داخل ہوجائیں تو ان سے بہتر سلوک نہ کیا جائے؟ اگر آپ یہ نہیں کہہ سکتے تو آپ کس منطق کی رُو سے مسیحیوں کو اچھوت ذاتوں کے ساتھ مساویانہ اور برادرانہ سلوک کرنے سے منع کر سکتے ہیں؟

اگر مسٹر گاندھی تواریخ کلیسیا سے واقف ہوتے تو ان پر واضح ہوجاتا کہ مسیحیت کی ترقی اس کی دُنیادی ترقی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کی اندرونی قوّت اور رُوحانی طاقت پر منحصر ہے۔ پہلی تین صدیوں میں مسیحیوں کو ہر طرح کی ایذائیں برداشت کرنی پڑیں۔ قیاصرۂ روم نے اپنا تمام زور مسیحیت کو تباہ کرنے کی خاطر خرچ کردیا لیکن مسیحیت دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ یہی حال ہر ایک مُلک میں کلیسیا کی ترقی کا ہوُا۔ انشاءاللہ یہی حال ہندوستان میں ہوگا۔ جس قدر مسٹر گاندھی اور ان کے ہم خیال اصحاب مسیحیت کو دبائیں گے اور مسیحی تبلیغ واشاعت کی ر[illegible]ں رکاوٹیں ڈالیں گے اسی قدر مسیحیت کی ترقی ہوگی کیونکہ شہدا کا خون کلیسیا کا بیج ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(۲۰)

مسٹر گاندھی نے اچھوت ذات کے لوگوں کیلئے ایک نیا نام تجویز کیا ہے۔ آپ ان کو "ہریجن" کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس کے معنی "وشنو کا بیٹا" ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ سوائے مسیحیت کے شمالی ہندوستان کے ہر مذہب نے ان غریبوں کیلئے نئے نام تجویز کر رکھے ہیں۔ اور یوں ذات کے وجود کو برقرار رکھا ہے۔ مثلاً جب کوئی چوہڑہ اسلام کا حلقہ بگوش ہوجاتا ہے تو اس کو "مُصلّی" کے نام سے

موسوم کیا جاتا ہے۔ اگر وہ آریہ دھرم قبول کرلیتا ہے تو شُدھ ہونے کے باوجود وہ "ہندو" نہیں بلکہ "مہاشہ" کہلاتا ہے۔ اور اگر وہ شُدھ نہ ہو تو "ہریجن" کہلاتا ہے لیکن مسٹر گاندھی کسی برہمن یا کشتری کو "ہریجن" یا "وشنو کا بیٹا" کہنے کی جرأت نہیں کرتے۔ جب کوئی چوہڑہ سکھ مذہب میں داخل ہوجاتا ہے تو وہ "مذہبی سکھ" کہلاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر مذہب نے اس بیچارے کو نیا نام دے رکھا ہے تاکہ ذات کی تمیز برقرار رہے۔ لیکن مسیحیت ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں کسی نومرید کو کوئی نیا نام نہیں دیا جاتا۔ اگر برہمن یا سید یا شیخ مسیحی ہوجائے۔ تو وہ "مسیحی" کہلاتا ہے۔ اگر چوہڑہ مسیحی ہوجائے تو وہ بھی "مسیحی" کہلاتا ہے۔ ذات کی تمیز کو سرے سے اڑا دیا جاتا ہے۔ دیگر مذاہب کے پیرو نہ صرف نیا نام دے کر اس تمیز کو برقرار رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی لڑکیوں کا بیاہ تک اِن نومریدوں سے نہیں کرتے اور یوں اس تمیز کو مستحکم کردیتے ہیں۔ لیکن مسیحیت کے حلقہ میں یہ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ اُونچی ذاتوں سے مسیحی ہوتے ہیں۔ وہ بے تامل اپنی لڑکیاں اُن قابل نومریدوں کو دے دیتے ہیں جو اچھوتوں سے مسیحی ہوتے ہیں۔ پس مسیحیت اپنی تعلیم اور کلیسیا اپنے فعل سے ہندوستان پر ثابت کر رہی ہے کہ ذات پات کی لعنت صرف مسیحیت کے قبول کرنے سے ہی دور ہو سکتی ہے۔ جب یہی لوگ جو بالفاظ مسٹر گاندھی "گائے بیل سے بدتر تھے اور جن میں رُوحانی بھوک نام کو بھی نہیں" مسیحیت کے حلقہ بگوش ہوگئے انہوں نے یہاں تک ترقی کی کہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق جہاں پندرہ فیصدی ہندو مرد اور ڈیڑھ فی صدی ہندو عورتیں پڑھ لکھ سکتی ہیں وہاں ان مسیحیوں میں ۳۲ فی صدی مرد اور ۱۸ فی صدی عورتیں لکھ پڑھ

سکتی ہیں۔ کیا یہ ترقی حیرت انگیز نہیں ہے؟ ہندو مت اور اسلام میں سرے سے یہ اہلیت ہی نہیں کہ وہ ان اچھوت اقوام کی ترقی کا وسیلہ ہو سکیں۔ مسٹر گاندھی نے پونا پیکٹ سے لے کر تا حال ان اچھوتوں کے لئے کیا کام کیا؟ اور ان کی زیر سرکردگی ان اقوام نے کیا ترقی کی؟ ہاں مسٹر گاندھی نے ان کی خاطر چند ایک "اُدھار سبھائیں" ضرور قائم کر دی ہیں جن میں چند بے فکرے اُدھار کھائے بیٹھے ہیں اور آئے دن ان سبھاؤں کی آمدنی کے صیغہ میں غبن ہوتا رہتا ہے۔ اچھوت اقوام کے ایک لیڈر جگدیش شنکر و دیارتھی کہتے ہیں:۔

"درحقیقت ہم اچھوت... شودر نہیں ہیں.... دراصل ہم باشندگانِ قدیم ہند جو آریہ حملہ آوروں سے پیشتر براعظم ایشیا کے حقیقی مالک اور حکمران تھے۔ آریوں نے غلام بنانے کے بعد نہایت ناپاک مکروہ ناموں سے نامزد کر کے تا قیامت ہماری اُنیس کروڑ کی تعداد کو محض برہمن کشتری بنئے کی خدمت گذاری کر کے اسی کو ہمارا جزو ایمان بنا دیا... حیوان کی طرح رات دن بلا معاوضہ کام کرنا اور انہی کے سڑے گلے باسی جھوٹے ٹکڑوں کو کھا کر شکم پروری کرنا۔ پھٹے پرانے چیتھڑوں سے تن پوشی کرنا۔ گندی جگہوں میں گھاس پھونس کی جھونپڑیاں بنا کر رہنا۔ گندے جوہڑوں سے جہاں گائے بھینس وغیرہ پانی پی کر اکثر پاخانہ پیشاب کر دیا کرتی ہیں۔ ایسا پلید پانی پینے پر ہم کو مجبور کیا جاتا ہے۔ تعلیم و ہنر ہماری اقوام کے روزِ اول سے قسمت میں نہیں لکھی۔ ہندو مذہب نے ہم کو حیوان بنا ڈالا۔ اس پر طرفہ یہ کہ ہم کو تا حال ہندو مذہب میں رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ہندوؤں کا اخلاقی فرض تو یہ ہے کہ ہمارے ساتھ تمام بدسلوکیاں والا وطیرہ چھوڑ کر رشتہ ناطہ میں منسلک کر دیا جاتا جیسا کہ عیسائی ہو جانے پر کر لیا جاتا ہے۔... ہماری اُنیس کروڑ کی تعداد

کو ہندو لکھوا کر ہمارے تمام حقوق حاصل کر کے برہمن کشتری۔ بنئے قوم کی سیاسی مالی۔ دماغی۔ فلاح اور بہبودی کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ منو سمرتی والا سلوک کیا جاتا ہے... ہندوؤں کے مندروں۔ دیو استھانوں، ہندو ہوٹلوں۔ دھرم شالاؤں۔ سرائے۔ کنوؤں۔ تالابوں۔ باولیوں وغیرہ پر سخت ممانعت ہے۔ بلکہ مر جانے پر بھی ہمیں ہریجن مرگھٹوں میں پھینکا جاتا ہے.. ہمارے حقوق کو قبضے میں لا کر ہندو اپنی ترقی کر رہے ہیں۔ اور ہماری غریب مظلوم جاتیوں کے لئے نہ کوئی سکول نہ اخبار نہ لائبریری نہ تعلیم و تربیت کا انتظام ہے..." (احسان لاہور ۲۶ فروری ۱۹۴۱ء)

دل ہی نہ رہا اُمید کس کی ۔ جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

مسیحیت نے ان کو قعرِ مذلت سے نکالا ہے۔ مسیحیت کی طفیل ان کو شدھ بدھ آ گئی ہے۔ ہندو مت نے ہزاروں سال سے اور اسلام نے صدیوں سے ان سے حیوانوں کا سا سلوک کر کے ان کو پامال کر رکھا تھا۔ مسیحیت نے پچاس سال کے اندر اندر ان کو تیرہ و تاریک زنداں سے نکال کر ان کے جسم، دماغ اور رُوح کی خبر گیری کی اور وہ اب اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو انسان سمجھ کر اپنی اقتصادی اور سیاسی ترقی کے خواہاں ہوں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا خوب کہا ہے:

"مستقبل زمانہ کی اشد ضرورت یہ ہے کہ تمدنی اور اقتصادی حالات کی بنیاد عدل اور انصاف کے اصولوں پر قائم ہو۔ اور اگر ہندو مت یا اسلام یہ کام نہیں کر سکتے۔ تو ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے"۔

ہندوستان کی تاریخ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہندو مت اور اسلام اپنے جمود و تعطل کی وجہ سے عدل اور انصاف کے اصولوں پر کاربند نہیں رہے۔ لہٰذا بالفاظ پنڈت جی "ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے"۔ ہندوستان کا مستقبل صرف مسیحیت

کے ہاتھوں میں ہے جس سے قوم ہند کی ترقی کی اُمید ہوسکتی ہے۔ ورنہ بہت

یُونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

(۲۱)

گاندھی جی کے مذکورہ بالا بیان کا ایک ایک لفظ مسیحی کلیسیا کے لئے خطرہ کی سُرخ جھنڈی کا کام دیتا ہے۔ ہم کو اب پتہ چل گیا ہے کہ مذہبی آزادی اور مسیحیت کی اشاعت و تبلیغ کے بُنیادی حقوق معرضِ خطر میں ہیں اور وہ گاندھی جی اور ان کے مقلدوں کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ گاندھی جی کیوں تبدیلِ مذہب پر اس قدر غوغا آرائی کرتے ہیں۔ ان کو اور دیگر قوم پرستوں کو اس امر کی طرف سے بے نیاز ہونا چاہئے کہ کون کس مذہب کا پیرو ہے۔ تاوقتیکہ وہ مُلک سے غداری نہ کریں۔ لیکن قوم پرستوں کی طرف سے تبدیلِ مذہب پر جو نکتہ چینی کی جاتی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصحاب خود قوم کے دلدادہ نہیں بلکہ فرقہ وارانہ ذہنیت رکھتے ہیں اور ان کی اصلی غایت یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کی اکثریت کو قائم رکھیں تاکہ وہ ہندوستان پر غالب رہیں۔ اس پہلو سے جب مسٹر گاندھی اور دیگر ہندو لیڈروں کے خیالات پر اور ان کی روش پر روشنی پڑتی ہے تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جب وہ مسیحیوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ مذہب اور سیاسیات کو جُدا نہیں کرتے اور ایک ہندو کی حیثیت سے بولتے ہیں اور جب برطانوی سلطنت سے مخاطب ہوتے ہیں تو قوم پرست ہو کر کہتے ہیں کہ مذہب اور سیاسیات دو جُداگانہ باتیں ہیں لیکن ان کا اصل مُدعا یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہندوؤں کا غلبہ قائم رہے ÷

(۲۲)

اس بیان میں ایک اور امر قابلِ غور یہ ہے کہ گاندھی جی مسیحی مبلغین

کو قید کی دھمکی دیتے ہیں جو مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی کیا یہ اُن کی آہمسہ کی تعلیم کا عملی پہلو ہے؟ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ برطانوی گورنمنٹ کے خلاف آپ کے ہاتھوں میں آہمسہ سے زیادہ زبردست حربہ نہیں ہے لہٰذا وہ آہمسہ پر زور دیتے ہیں لیکن اپنے ہموطنوں کے خلاف وہ تشدد استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کو آزادی مل جائیگی تو آپ اپنے آہمسہ اور ستیا گراہ کے اصولوں کو الوداع کہدیں گے۔ اور نرمی اور محبت کی بجائے ہندوستانی مسیحیوں کو قید اور سختی کی دلیل سے سمجھایا جائیگا۔ لیکن ان کو خود اپنے تجربہ سے جاننا چاہئے کہ قید اور تشدد اُس شخص کے لئے بے معنی چیزیں ہیں جو پہاڑی وعظ کے اعلیٰ ترین اصولوں کے ہتھیاروں سے مقابلہ کرتا ہے۔ ان کو یہ جان لینا چاہئے کہ شہیدوں کا خون کلیسیا کا بیج ہے اور مسیحی کلیسیا کا پودا اسی خون سے پرورش پاتا ہے ÷

حقیقت تو یہ ہے کہ گاندھی جی قید و تشدد کی دھمکیاں اس واسطے دیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مسیحیت ہندو دھرم پر اور ہندوستان پر غالب ہو کر رہیگی۔ کیونکہ کوئی شخص کسی بے جان اور نیم مُردہ چیز سے جو خود ہی دم توڑ رہی ہو خائف و ہراساں ہو کر دھمکیاں نہیں دیتا۔ مہاتما جی جانتے ہیں کہ اگرچہ مسیحیت اس مُلک میں کمزور نظر آتی ہے لیکن بے جان اور بے حس نہیں ہے۔ اس میں مسیح اپنا دم پھونک کر زندہ کر سکتا ہے اور کریگا اور مسیح ہندوستان کا واحد تاجدار اور حکمران ہو کر رہیگا ÷

(۲۳)

ہم حیران ہیں کہ ہر شراب کش کارخانہ کو شراب کے اشتہارات دینے کا حق حاصل ہے۔ حالانکہ شراب خانہ خراب ہندوستانی قوم کے حق میں

سمِ قاتل کا کام دیتی ہے۔ ہر تماشہ گاہ اور سینما والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ مخربِ اخلاق تماشوں کے اشتہارات آزادانہ دیں اور یوں قوم کے اخلاق کو تباہ کریں۔ لیکن مسیحی کلیسیا کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ انجیل کا پرچار کرے تاکہ ہندوستان میں اُخوت و مساوات کے اصُول قائم ہوں اور خُدا کی ابوت اور انسانی اُخوت و مساوات کے اصُول ہندوستان کی بکھری قوم کی شیرازہ بندی کریں ؎

آپ ہی اپنے ذرا طرزِ عمل کو دیکھیں ہم جو کچھ عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

اگر مسیحیوں کو اشاعت و تبلیغ سے قانوناً روکا گیا تو یہ ظاہر ہے کہ وہ اپنے خُداوند اور مُنجی کے حُکم کی اطاعت کرنا اور لوگوں کو نجات کی خوشخبری سُنانا اپنا فرضِ اوّلین سمجھ کر پُرامن طریقوں سے ایسے ناجائز قانون کی خلاف ورزی کریں گے۔ ستیاگرہ کا ہتھیار مسٹر گاندھی۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لئے نیا ہے لیکن مسیحیوں کے لئے اور کلیسیا کیلئے وہ دو ہزار سال سے آزمایا ہُوا ہتھیار ہے۔ خُداوند مسیح نے سب سے پہلے اس ہتھیار کو استعمال کیا جب آپنے اپنے حواری پطرس کو فرمایا :-

"اپنی تلوار کو میان میں کر۔ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ تلوار سے ہلاک کر دئے جائیں گے۔ کیا تُو نہیں جانتا کہ مَیں اپنے باپ سے مِنّت کر سکتا ہوں اور وہ فرشتوں کی بارہ تُمن ہزار سے زیادہ فوج ابھی موجود کر دیگا"۔

مُنجی عالمین نے ترکی بہ ترکی جواب دیئے بغیر صلیب کی راہ اختیار کی۔ یہی حربہ خُداوند کے رسُول مقدس پطرس اور رسُولوں نے استعمال کیا جب آپ کو عدالت میں سردار کاہن نے کہا ۔

"ہم نے تُم کو سخت تاکید کی تھی کہ یسُوع کے نام کی تعلیم نہ دینا۔ مگر تُم

نے تمام یروشلم میں یہ تعلیم پھیلا دی ہے"۔

اس پر سردار کاہن کو جواب دیا گیا کہ :-

"آدمیوں کے حکم کی نسبت خُدا کا حکم ماننا زیادہ فرض ہے خُدا نے یسُوع کو مالک اور مُنجی ٹھہرایا تاکہ لوگوں کو توبہ کی توفیق اور گناہوں کی معافی بخشے اور ہم ان باتوں کے گواہ ہیں"۔

اس پر سردار کاہن نے ان کو پٹوایا۔ لیکن وہ ہر روز اس بات کی خوشخبری دینے سے کہ یسُوع ہی مسیح ہے باز نہ آئے (اعمال ۵ باب) ہندوستانی مسیحی انجیل جلیل کے دستورِ حیات کو تسلیم کر کے اپنے مُنجی کا پیغام تمام خلق اللہ کو پہنچانے سے کبھی باز نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی بشارت کا پیغام ہے جو ہر زمانہ اور ہر مُلک کے لئے خوشی کی خبر ہے۔ بالخصوص ہمارے وطن ہندوستان کو اس کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہمارے مُلک کی زندگی کی کایا پلٹ جائے۔ اور ہمارے مُلک و قوم کی حالت میں انقلاب برپا ہو جائے اور وہ چاہِ ذلت سے نکل کر رُوحانیت کے اوج پر پہنچ جائے۔ مرحوم لارڈ مارلے ایک ملحد شخص تھا۔ لیکن اس نے کہا ہے :-

"اگر مَیں فی الحقیقت اس بات کا قائل ہوتا کہ یسُوع مسیح نے میری نجات کی خاطر اپنی جان دی ہے تو میری زبان کبھی کسی دوسری بات کا تذکرہ ہی نہ کرتی اور میرا قلم کسی دوسرے مضمون پر کبھی ایک سطر بھی نہ لکھتا"

جب ایک ملحد کا یہ حال ہے تو ایک مسیحی جو الٰہی محبت اور غیرت کی آگ سے جل رہا ہو اپنے کروڑوں ہموطنوں کو جو بغیر مسیح کی محبت اور بائبل کے علم کے اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں کس طرح سرد مہری سے دیکھ سکتا ہے ؟

23. Macnicol, Nicol
24. Otto, Idea of the Holy.
25. Paton, William
26. Polak, Mr. Gandhi, the Man.
27. The Quran.
28. Radha Krishnan, Sir S. Philosophy of Rabindra Nath Tagore.
29. Radha Krishnan, Sir S., Hindu View of Life.
30. " " Sir S., Idealist View of Life.
31. Roy, Raja Ram Mohan, Works.
32. Rethinking Missions, Appraisal Commission's Report.
33. Satyarath Parkash, Tr. by Radha Kishen Mehta.
34. Sorley, Moral Values and the Idea of God.
35. The Student World.
36. The Student Outlook.
37. Similarity of All Religions.
38. Tagore, Sir Rabindranath, Letters to a Friend.
39. " " " Sadhna.
40. " " " Personality.
41. Taylor, The Faith of a Moralist.
42. Temple, William-Archbishop of York.
43. Vivekanand Swami, Works.
44. World's Parliament of Religions, 1893.
45. World Mission of Christianity.

C. M. S.
PATTOKI, DISTT. LAHORE.
Feb. 28th 1941.

BARAKAT ULLAH.

ے خسرو اور عشق بازی کم زہ مندہ زن مباش
کاں برائے مُردہ سوزد زندہ جانِ خویش را

جرمن فلاسفر ٹروئیلش نے کیا خوب کہا ہے کہ:-
"اگر ایمان میں تبلیغ و اشاعت یا توسیع کی جرأت نہیں تو وہ "ایمان" کہلانے کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ ایمان کے اندر ایک ایسا جبر پایا جاتا ہے۔ جو ایماندار کو اس بات پر مجبور کرتا ہے۔ کہ وہ اپنے ایمان کی خصوصیات دوسروں تک پہنچائے۔ اگر ہم رواداری کی حد کو قائم نہیں کرتے تو رواداری کا صحیح مفہوم نہیں جانتے اور الحاد کے کنارے جا پہنچتے ہیں... سچ پوچھو تو رواداری موجودہ زمانہ کی بیماری ہے اور ایمان کی کمزوری اور لاچاری کا دوسرا نام ہے۔"[1]

ہندوستان کی کلیسیا ہرگز اس قسم کی رواداری کو اپنا دستور العمل نہیں بنا سکتی۔ اُس کا خُداوند زندہ غالب اور فاتح ہے لہذا وہ اُس کا نجات بخش پیغام ہر ذی رُوح کو پہنچانا اپنا فرضِ اولین سمجھتی ہے اور اس کا ہر فرد روزِ آخر تک اس فرض کو خُدا کے فضل سے ادا کرنا موجبِ سعادتِ دارین خیال کرتا رہے گا ✚

[1] Troeltsch, quoted by Cave p. 31

The writer wishes to acknowledge his indebtedness to the following authors, books and periodicals in the preparation of this work :—

1. Andrews, C. F., Mahatma Gandhi's Ideas.
2. Edley Bishop, The Solitary Throne.
3. Bhagwat Gita, Tr. Mrs. Besant.
4. Cash, Missionary Church.
5. Cave, Hinduism and Christianity.
6. Das Gupta, History of Indian Philosophy.
7. Edward's India's Challenge to Christian Missions.
8. Frazer, Sir J. G., The Golden Bough.
9. The Guardian, Madras.
10. Gandhi, M. K., Story of my Experiments with Truth.
11. The Harijan, ed. by M. K. Gandhi.
12. Huxley, J. S. Essays of a Biologist.
13. The Indian Social Reformer, Bombay.
14. Iqbal, Sir Mohammad
15. Jawahir Lal Nehru, Autobiography.
16. Kraemer, Christian Message in a Non-Christian World.
17. Lecky, History of European Morals.
18. Mirror of Indian Philosophy.
19. Mahatma Gandhi by Gray and Parekh.
20. Mozamdar, Pramahamsa Rama Krishna.
21. Morley, On Compromise.
22. Mufti Ghulam Rasul's Version of Bhagwat Gita.

انتخاب پریس لاہور میں
باہتمام مسٹر ایف۔ ڈی۔ وارث پرنٹر و پبلشر چھپکر
دفتر ایس۔ پی۔ سی۔ کے انارکلی لاہور سے شائع
ہوئی